رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۴۰

جلد ۴۸ عدد ۴

شوال ۱۳۷۶ھ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ — لاہور پاکستان

چندہ سالانہ چھ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

خــــالی صفحـــــہ

ترجمان القرآن

لاہور

فہرست مضامین

جلد ۴۸	شوال ۱۳۷۶ھ	جولائی ۱۹۵۷ء	عدد ۴

سید ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر ماہنامہ ترجمان القرآن نے دی پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور

میں چھپوا کر اچھرہ لاہور سے شائع کیا

باسمہ تعالیٰ

اشارات

ہم میں سے کون شخص ہے جو ایٹم بم کے نام اور اس کی تباہ کاریوں سے واقف نہ ہو۔ اس کی فنی تفصیلات کا احاطہ تو ایک بڑا سائنسدان ہی کر سکتا ہے ہم عامی آدمی اس سلسلے میں صرف یہی کچھ جانتے ہیں کہ مادہ کی منظم دنیا جو بظاہر ٹھوس نظر آتی ہے۔ حقیقت میں محض قوت یا توانائی (ENERGY) کی لہروں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ لہریں ایک ترتیب اور نظم کے ساتھ ایک دوسرے کے گرد گردش کرتی ہیں۔ یہ گردش جس طرح بڑے بڑے اجرامِ فلکی میں موجود ہے۔ اسی طرح چھوٹے چھوٹے ذرات میں بھی پائی جاتی ہے اور اسی سے ان کا وجود قائم ہے۔ سائنسدانوں نے کسی طریق سے ان لہروں کی ہم آہنگی کو ختم کر کے ان میں اختلال و انتشار پیدا کر دیا ہے اور یہی چیز انسانیت کے لئے زبردست ہلاکت کا باعث بنی ہے۔ ایک ایسی ہلاکت جس کے تصور سے بھی جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور جس کی کوئی دوسری نظیر تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔

مادہ کی طرح انسان کا اخلاقی وجود بھی افکار و تصورات اور احساسات کی لہروں سے مرکب ہے ان میں جب تک ہم آہنگی ہے۔ اس وقت تک انسانی قوتوں کا زیاں نہیں ہوتا لیکن جب بھی انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنے کی کوشش کی جائے تو اس سے انسان اخلاقی طور پر بالکل تباہ ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ شعور و احساس کی یک جہتی اور ہم آہنگی وہ قوتِ ناظمہ ہے جو انسانی سعی و عمل کے مختلف گوشوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرتی ہے۔ نہیں باہم ایک دوسرے سے جوڑ کر ترقی کی راہ پر لگاتی ہے۔ اسی سے انسانی سیرت و کردار کے منتشر اجزا کے درمیان باہمی ربط پیدا ہوتا ہے اور اس طرح متناسب و متوازن شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر حیاتِ انسانی کے مختلف عناصر کے مابین

کوئی قوتِ رابطہ باقی نہ رہے تو اس سے انسان کی صلاحتیں بالکل ضائع ہو جاتی ہیں ۔

آپ کو اگر ایک فرد کے نقدِ احساس میں اختلال کے نتائج کا صحیح اندازہ کرنا مقصود ہو تو آپ ایک ایسے شخص کی نفسیاتی کیفیات کا جائزہ لیں جسے عدالت کے کٹہرے میں یا بہ زنجیر کھڑا کر کے کسی خارجی دباؤ کے تحت خود اپنے خلاف ہی جھوٹی گواہی دینے پر مجبور کر دیا گیا ہو ۔ یہ شخص اپنی جان کو تشدد سے بچانے کی خاطر اپنی زبان سے سب کچھ وہی ادا کرتا ہے جس کا استبداد اس سے تقاضا کرتا ہے ۔ اس کے الفاظ بڑے موزوں اور اس کے فقرے بڑے نپے تلے ہوتے ہیں لیکن یہ اس کے اپنے کارخانۂ دل سے ڈھل کر نہیں آتے ۔ یہ سب غیروں کا مال ہوتا ہے جسے وہ اپنا کہہ کر منڈی میں با دلِ ناخواستہ پیش کرتا ہے ۔ یہ مستعار فقرات اس کے حلق کے صوتی تاروں کو تو بلاشبہ متحرک کرتے ہیں لیکن اس کے قلب کی گہرائیوں میں کوئی ارتعاش پیدا نہیں کرتے جب زبان و دل کی لہروں میں توافق ختم ہو جائے تو اس سے انسان میں نہایت ہی خوفناک قسم کی نفسیاتی بیماریاں پرورش پانے لگتی ہیں جو بالآخر اسے برباد کر کے رکھ دیتی ہیں ۔ ایسے شخص میں ایک قسم کا تکلف سا پیدا ہو جاتا ہے اس کی حرکات و سکنات میں وہ بے ساختگی باقی نہیں رہتی جو ایک مخلص انسان کا طرۂ امتیاز ہے وہ اظہارِ مدعا کے لیے بالکل مصنوعی اداکاری سے کام لیتا ہے وہ ہر وقت اپنے آپ کو ایک ناگوار بوجھ تلے دبا ہوا پاتا ہے ۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ اضطراب کے آثار نمایاں رہتے ہیں گو وہ اپنی اس خانہ جنگی کو خواہ سنجیدگی کے کتنے ہی موٹے موٹے پردوں میں چھپا کر رکھے لیکن ہر دیدہ ور شخص اس حقیقت کو بآسانی جان لیتا ہے کہ اس کے افکار و احساسات کی لہروں میں ایک زبردست کشمکش برپا ہے جس نے اس کے دل کی دنیا کو بالکل تہ و بالا کر دیا ہے اور یہ انتشار دروں خانہ اسے اندر ہی اندر کھوکھلا کرتا جا رہا ہے ۔

ایک فرد کی طرح ایک قوم کے لیے بھی اس سے بڑی ہلاکت اور کوئی نہیں ہو سکتی ۔ اس کے افراد کو خود اس کے نظریات و معتقدات خود اس کے اجتماعی شعور تہذیبی امنگوں اور نصب العین کے خلاف صف آرا کر دیا جائے

کسی بڑے سے بڑے ہائیڈروجن بم کا حملہ اپنے نتائج کے اعتبار سے اتنا مہلک اور تباہ کن ثابت نہیں ہوتا جتنا کہ ذہنی خلفشار۔ مادہ کی منظم لہروں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے سے بلاشبہ انسان کے ہاتھ میں ایک ایسا خوفناک ہتھیار آجاتا ہے جو آن کی آن میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں انسانوں کو بھسم کر کے رکھ دیتا ہے۔ لیکن وہ تباہی جو کسی قوم پر اس کی اخلاقی بنیادوں کو درہم برہم کر دینے سے مسلط ہوتی ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کی وجہ سے پوری قوم کی قوتیں ایک مرکز پر جمع نہیں ہونے پاتیں۔ وہ ہمیشہ بکھری ہوئی اور منتشر رہتی ہیں۔ اس قوم کی حالت اس کشتی کی سی ہوتی ہے جو طوفانوں میں گھری ہوئی ہو لیکن جسے کھینے والے پوری محنت کے ساتھ اسے مختلف سمتوں کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ اس قسم کے کوتاہ اندیش ناخدا اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا دیوالہ بھی نکال دیتے ہیں اور کشتی بھی ساحلِ مراد تک پہنچنے نہیں پاتی۔ وہ ہمیشہ طوفانوں میں گھری رہتی ہے اور آخرکار خود اپنے ہی کرم فرماؤں کی "مخلصانہ کوششوں" سے سمندر میں غرق ہو جاتی ہے۔

اگر ہم مسلم قوم کی پچھلی دو سو سالہ تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہماری ملت کے سفینہ کو بھی اس قسم کے ناخداؤں سے واسطہ رہا۔ انہوں نے یہ معلوم کرنے کی زحمت تک گوارہ نہ کی کہ جس کشتی کو وہ چلانے کا عزم رکھتے ہیں اس کے مسافروں سے یہ تو دریافت کر لیا جائے کہ آخر وہ جانا کہاں چاہتے ہیں۔ ان حضرات نے جب دوسری کشتیاں چلتی دیکھیں تو بغیر کسی غور و فکر کے ان کے ساتھ اپنی کشتی کو بھی حرکت دیدی۔ اس کے مسافر جن کی منزل دوسروں سے بالکل الگ اور جداگانہ ہے کچھ دیر تو صبر سے دیکھتے رہے لیکن جب انہیں اس امر کا احساس ہوا کہ جس سمت کی طرف انہیں لے جایا جا رہا ہے وہ ان کی اصل منزل نہیں تو ان کے اندر ایک سخت اضطراب پیدا ہوا۔ انہوں نے ایک طرف تو چپوؤں پر قبضہ کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف انہیں جو کچھ بھی میسر آیا اس کی مدد سے کشتی کو دوسری سمت میں لے جانا شروع کیا۔ ناخداؤں اور مسافروں کی اس باہمی آویزش سے دونوں کی قوتیں برباد ہو کر رہ گئیں اور "سفینۂ امت" ایک انچ بھی نصب العین کی طرف حرکت نہ کر سکا۔

ملّتِ اسلامیہ کے لیئے یہ کشمکش جو اس کے رہنماؤں اور عوام کے درمیان زمانۂ دراز سے مسلسل جاری ہے اپنے نتائج کے لحاظ سے بڑی افسوسناک ہے۔ اس کشمکش سے اس قوم کی صلاحیتوں کو آج تک کسی تعمیری کام پر لگنے نہیں دیا گیا بلکہ ہمیشہ اسی سر پھٹول میں ضائع ہوئیں۔ مغربی امپریلزم نے جن مسلم ممالک کو تاخت و تاراج کیا اُن میں ایک بنے بندھے منصوبے کے مطابق ان لوگوں کو ابھارا گیا جو اپنے آقاؤں کی تہذیب و تمدّن پر فریفتہ تھے اور دل و جان سے اس بات کے متمنّی تھے کہ کسی طرح اس قوم کو بھی اُن کے رنگ میں رنگ دیا جائے لیکن ملّتِ اسلامیہ کے عام افراد کبھی بھی اس چیز پر راضی نہ ہوئے۔ ان کے اندر ہمیشہ سے یہ احساس رہا ہے کہ ان کا رنگ اس رنگ سے بالکل مختلف اور جدا ہے جس میں ان کے مغرب پرست رہنما انہیں رنگنا چاہتے ہیں۔ مسلم عوام اپنی اُن روایات کو ترک کرنے پر راضی نہ تھے جن سے ان کے اجتماعی شعور کا خمیر اٹھایا گیا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے ماضی کی طرف پلٹنے کی کوشش کی۔ اُن کے دل میں ہر وقت چھپا ہوا احساس رہا کہ جو کچھ ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہو رہا ہے۔ وہ اپنی ساری خامیوں کے باوجود ہر دور میں اس بات کے آرزومند رہے ہیں کہ اُن کی زندگی کا نقشہ اُن خطوط پر مرتب ہونا چاہیے جو انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے جلیل القدر اصحاب سے ورثہ میں ملا ہے۔ یہ احساس کئی بار مختلف تحریکات کی شکل میں رونما ہوا اور یہی احساس وہ واحد قوت ہے جس نے اس ملّت کو ایک الگ قوم کی حیثیت سے آج تک زندہ رکھا ہے۔ جن لوگوں نے اس قوم کی نفسیات سمجھے بغیر اس کے فکر و احساس کی لہروں میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی ہے انہوں نے اس پر سخت ظلم کیا ہے ایک ایسا ظلم جو ہلاکو اور چنگیز خان ایسے دشمنوں کے مظالم سے کہیں زیادہ ہے۔ ان حملہ آوروں نے تو زیادہ سے زیادہ مسلم ممالک کی دولت کو لوٹا، اُن کے باشندوں کو غلام اور لونڈیاں بنایا، اُن کے نوجوانوں کو ہلاک کیا۔ لیکن قوم کے ان "مخلص ناخداؤں" کی کوششوں سے قوم کی تہذیب برباد ہوئی۔ اس کی روایات مٹائی گئیں۔ الغرض ہر وہ چیز جو کسی قوم کی حیاتِ اجتماعی کے لیے ضروری ہو سکتی ہے اسے ایک ایک کر کے نیست و نابود کیا جانے لگا۔

اس وقت شاید ہی دنیا کا کوئی ایسا اسلامی ملک ہو جس میں "مغرب پرست" رہنماؤں کا کوئی گروہ اس

منہ کا احمقانہ کھیل نہ کھیل رہا ہو۔ ترکی، مصر، شام، ایران، پاکستان، الغرض دنیا کے ہر اُس خطے میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے، یہ کشمکش جاری ہے۔ اور اس طرح مسلم قوم کی صلاحیتیں بالکل عبث میں برباد ہورہی ہیں۔ مغربی طرزِ فکر کے حاملین جنھیں بدقسمتی سے آج قوم کی سربراہی کا منصب بھی حاصل ہے، اس کا ماضی سے رشتہ توڑ کر اسے بالکل مغربی تہذیب کا پرستار بنانا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف وہاں کی بھاری اکثریت ان لوگوں کے ان عزائم کو نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور ان کا ساتھ دینے پر تیار نہیں ہوتی۔ اس طرح قوم کے اپنے لوگ ہی ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہیں۔

ان اوراق میں ہم صرف ایک ملک یعنی ترکی اور اس کے صرف ایک شعبہ زندگی یعنی تعلیم و تربیت میں اس کشمکش اور اس کے نتائج سے اپنے قارئین کو روشناس کرانے کی کوشش کریں گے اور بتائیں گے کہ اس قسم کی کوششیں جن کی پشت پر حکومت کی قوت اور اس کے ذرائع و وسائل موجود تھے کیونکر ناکام ہوئیں۔ اس ضمن میں ہم جو معلومات پیش کر رہے ہیں وہ ہم نے مشہور عیسائی رسالے مسلم ورلڈ (MUSLIM WORLD) کے دو شماروں سے اخذ کی ہیں۔ یہ پرچہ اسلام سے سخت عناد رکھتا ہے اور کسی مسلمان قوم میں اسلامی احساسات کی زندگی اس کو سخت ناگوار ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے یہ معلومات اس بات کا ثبوت دینے کے لیے فراہم کی ہیں کہ ترکی میں لامذہبیت کو فروغ دینے کی کوششیں غلط تھیں۔ پھر ان کو جس شخص نے فراہم کیا ہے وہ بھی کوئی "تنگ نظر ملا" نہیں جس نے تعصب اور جانبداری سے کام لیتے ہوئے مصطفےٰ کمال کی مساعی کو جان بوجھ کر ناکام ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا مہیا کرنے والا ایک مسیحی پادری ہاورڈ اے ریڈ (HOWARD A. REED) ہے جس سے بڑھ کر شاید ہی کسی کو ایک مسلمان قوم کے نامسلمان ہو جانے سے خوشی ہو سکتی ہوگی اس لیے اس کی فراہم کردہ معلومات پر یہ شک نہیں کیا جا سکتا کہ یہ اسلام کے حق میں اور سیکولرزم کے خلاف کوئی پراپیگنڈا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے مغرب پرست حضرات آنکھیں کھول کر ان معلومات کو دیکھیں اور پھر غور کریں کہ ایک قوم کی حکومت اپنی قوم کی روایات اور اس کے اجتماعی شعور سے لڑ کر آخر کیا حاصل کرتی ہے۔

دنیا کا ہر تمدن تین بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ ماں کی گود، تعلیم و تربیت کے گھوارے اور زبان جب تک انہیں تبدیل نہ کیا جائے اس وقت تک کوئی ویسا تمدن پیدا نہیں کیا جا سکتا جس کی جڑیں انسان کے دل و دماغ میں پیوست ہو چکی ہوں۔ اتاترک اور ان کے ساتھیوں نے اس حقیقت کو اول روز سے ہی اچھی طرح جان لیا تھا چنانچہ انہوں نے اپنی قوم کو مغربی رنگ میں رنگنے کے لئے ضروری سمجھا کہ ان تینوں کو تبدیل کیا جائے۔ ان کی سب سے پہلی زد ان مدارس پر پڑی جہاں دینی تعلیم دی جاتی تھی۔ حکومت کی پوری مشینری کو حرکت میں لا کر ان مدارس کے خلاف ایک نفرت کی فضا تیار کی گئی۔ انہیں جہالت کے اڈوں سے تعبیر کیا جانے لگا اور قوم کے دل میں یہ بات ڈالنے کی کوشش کی گئی کہ وہ جب تک انہیں ختم نہیں کرتی اس وقت تک اس کے لئے ترقی کے سارے دروازے مسدود رہیں گے۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۲۵ء کو اتاترک کے سامنے "چند سرپھروں" نے یہ عرضداشت پیش کی کہ دینی مدرسے کھولنے کی پھر سے اجازت دے دی جائے۔ اس درخواست کو نہایت حقارت آمیز طریقے سے ٹھکراتے ہوئے ترکی جدید کے بانی نے کہا: "یہ مدارس دراصل برائی کے وہ اڈے ہیں جہاں سے قوم کو ہمیشہ نقصان پہنچتا رہا ہے" پھر اس نے عرضداشت پیش کرنے والے مذہبی گروہ سے یوں خطاب کیا: "تمہیں اگر یورپین طرز کے اسکول نہیں چاہئیں تو کوئی مضائقہ نہیں، قوم ان کو چاہتی ہے۔ اس غریب قوم کے غریب بچوں کو تہذیب و تمدن میں ترقی کرنے دو۔ دینی مدرسے ہرگز دوبارہ جاری نہیں ہونے دیئے جائیں گے۔ قوم کی خدمت کے لیے نئی طرز کے ہی اسکول مطلوب ہیں۔"

مصطفےٰ کمال نے ان دینی مدارس کے متعلق جو طرز عمل اختیار کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان اداروں میں پڑھنے والوں کی تعداد آہستہ آہستہ گھٹنے لگی اور اس طرح یہ مراکز خود اپنے ہی فرزندوں کی سرمہری کا شکار ہو کر دم توڑنے لگے۔ ۱۹۲۴ء میں ان سے استفادہ کرنے والے طلبا کی تعداد ۲۴۲ تھی ۱۹۳۳ء میں وہ گرتے گرتے صرف بیس رہ گئی۔

اس پالیسی کی لپیٹ میں جو دوسری چیز آئی وہ عربی زبان تھی۔ کسی قوم کی زبان اس کے افراد کے درمیان محض اظہار خیال کا ذریعہ ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ وہ زبردست قوت ہے جس سے احساسات و کیفیات کی ساری منتشر

طاقتیں شخصیت کی گہرائیوں میں سموئی جاتی ہیں۔ اسی سے ہمارے اندر ایک خاص ذہنی میلان پیدا ہوتا ہے جو بالآخر ایک خاص طرز فکر اور ایک خاص قسم کی سیرت و کردار پر منتج ہوتا ہے۔ اسی سے ہمارے اجتماعی شعور کا ہیولیٰ تیار کیا جاتا ہے اور اسی کی وساطت سے ایک دم اپنے ماضی اور اس کی تاریخی روایات سے وابستہ رہتی ہے۔

عربی زبان کی اہمیت تو مسلم قوم کے لیے اور بھی زیادہ ہے۔ یہ وہ زبان ہے جس میں ہمیں احکام الٰہی ملے ہیں۔ جس کے ذریعہ ہمارے ہادیٔ برحق نے ہم تک اللہ کا پیغام پہنچایا ہے۔ ہمارا بیشتر دینی سرمایہ اسی زبان میں ہے۔ اس کے علاوہ یہ وہ قوت رابطہ ہے جس نے مسلم ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کے درمیان یگانگت پیدا کی ہے اور ہمیں ایک رشتۂ اخوت میں پرو دیا ہے۔ اس لیے جو فرد بھی اس زبان کے خلاف کوئی قدم اٹھاتا ہے وہ دراصل دین کے خلاف کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس نے زبان کی اہمیت سے انکار کیا ہو۔ اس لیے جب بھی کسی غیر ملکی قوم نے ایک دوسری قوم کو باہر سے آکر غلام بنایا تو اس نے اپنی استعماریت کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے سب سے پہلے زبان بدلنے کی کوشش کی، کیونکہ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ زبان کے ڈھانچے بدل دینے سے قلب و نگاہ کے زاویئے بدل جاتے ہیں۔ آج ہندوستان میں اردو کے خلاف جو مہم جاری ہے وہ اسی چیز کا بین ثبوت ہے۔ ہمارے اپنے ملک کے بسنے والے بھی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ انگریزی تہذیب و تمدن کو یہاں قائم رکھنے کے لیے انگریزی زبان کتنی ضروری ہے اور ہمارا برسرِ اقتدار طبقہ اس کو یہاں رواج دینے کے لیے کیا کچھ کوششیں کر رہا ہے۔ زبان درحقیقت ایک تہذیب کا نشان (SYMBOL) ہوتی ہے۔

اتاترک اس صورتِ حال سے پوری طرح آگاہ تھا۔ چنانچہ اُس نے جب ترکوں کا تعلق اسلامی روایات سے توڑنا چاہا تو سب سے پہلے انھیں عربی زبان کو ترک کرنے کی تعلیم دی۔ یہ کام بڑی ہوشیاری سے سرانجام پایا۔ سب سے پہلے لوگوں کے ذہن میں اس خیال کو راسخ

کیا گیا کہ عبادت انسان کو ایسی زبان میں کرنی چاہیے جس کے معانی و مطالب سے انسان اچھی طرح واقف ہو۔ جب لوگ اس بات پر کسی حد تک مطمئن ہو گئے تو پھر ان سے نہایت ہی معصومانہ انداز میں یہ کہا گیا کہ اس مقصد کے لیے ایک انسان کی مادری زبان کے سوا اور کون سی زبان زیادہ موزوں ہو سکتی ہے کچھ مدت گزر جانے کے بعد ان کا ذہن اس طرف منتقل ہونے لگا کہ یہ عربی زبان تو ایک غیر ملکی قوم کی زبان ہے، اس لیے ہماری آزادی کی تکمیل بجز اس کے ممکن نہیں کہ اسے زندگی کے سارے شعبوں سے یکسر خارج کر دیا جائے۔ چنانچہ اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ترکی زبان میں نماز ادا کرنے اور اذان دینے کا طریقہ رائج کیا گیا۔ یہ تبدیلی اسلام کے خلاف ایک کھلی سازش تھی جسے ترک قوم شروع میں تو پوری طرح نہ سمجھ سکی لیکن جونہی اس طرف کچھ مزید قدم اٹھائے گئے تو پھر اس پر اصل حقیقت روشن ہو گئی اور اس نے اس تحریک کی مزاحمت شروع کر دی۔ یہاں تک کہ پہلے ترکی نماز کا قصہ ختم ہوا اور آخرکار پچیس سال کے بعد ترکی اذان کی جگہ پھر سے عربی اذان کی اجازت دینی پڑی۔

اس پروگرام کا تیسرا جزو یہ تھا کہ ترکی زبان کا رسم الخط عربی سے لاطینی کر دیا جائے۔ یہ تبدیلی بھی نتائج کے اعتبار سے کچھ کم اہم نہ تھی۔ اس کا پہلا اثر یہ ہوا کہ ترکی قوم آس پاس کی تمام اُن مسلمان قوموں سے کٹ گئی جن کے ساتھ صدیوں سے اس کا تعلق تھا اور ان مغربی قوموں سے اس نے رشتہ جوڑنا چاہا، جن کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ اشتراک قائم نہ ہو سکتا تھا اور نہ ہوا۔

اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی قوم کا رشتہ خود ترکی زبان بولنے والے اُن لوگوں سے بھی منقطع ہو گیا جو ترکی کے باہر پائے جاتے تھے اور جو ابھی پرانے رسم الخط ہی میں لکھنے اور پڑھنے کے عادی تھے۔

اس تبدیلی سے ملک کے باشندوں کے لیے اُن کی پچھلی نسلوں کا سارا علمی و ادبی کارنامہ ایک اجنبی چیز بن کر رہ گیا جو صدیوں کے دوران میں فراہم ہوا تھا۔ ترکی قوم اپنے ماضی سے کٹ گئی۔ یہ گویا اس امر کا اعلان تھا کہ پچھلی صدیوں کے دوران میں ترک قوم کوئی ایسی چیز پیدا کرنے کے قابل نہ تھی جس پر اس کے اخلاف فخر کر سکیں اور جسے زندہ رکھنے کے لیے قابل قدر پائیں۔ اب وہاں صورت حال

یہ ہے کہ اس ملک کے کتب خانوں میں ترک علماء و فضلاء اور اہل قلم کی بے شمار کتابیں بیکار پڑی ہیں جنہیں پڑھنے اور سمجھنے والا ملک میں کوئی نہیں ہے۔ اس معاملے میں لطف کی بات یہ ہے کہ اب مذہبی تعلیم کے از سرنو آغاز کے بعد ترکوں کو بھی یہ ضرورت پیش آئی ہے کہ اپنے اماموں اور خطیبوں اور فوج کے مذہبی معلموں اور دیگر دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبا کو اس قابل بنائیں کہ وہ پچھلے زمانے کے ترک علما کی کتابیں پڑھ سکیں۔ اس غرض کے لیے اب ان لوگوں کو خود اپنی ہی زبان کے پرانے رسم الخط کی تعلیم اس طرح دی جارہی ہے جیسے کسی غیر ملکی زبان کی تعلیم دی جاتی ہے اور دینیات کے نئے نصاب میں پرانی ترکی تیس چالیس برس پہلے کی زبان، سکھانے کا انتظام کیا گیا ہے۔

تمدن اسلامی کے قصر کو گرانے کے لیے جو تھا حملہ اس کے سب سے زیادہ طاقتور مرکز یعنی مسجد پر کیا گیا۔ یہاں بھی ایک گہری چال کے ذریعہ پہلے عوام کے اندر اس احساس کو ابھارنے کی کوشش کی گئی کہ عبادت وہی صحیح ہے جس سے انسان کو روحانی سرور حاصل ہو، اس لئے طریق عبادت پُرتحسین اور رُوح پرور ہونا چاہیے۔ اس احساس کے اندر بظاہر کوئی پہلو قباحت کا نہ تھا۔ لیکن اس مقصد تک پہنچنے کے لیے جو ذرائع استعمال کیے گئے وہ وہ تھے جنہیں اسلام نے بالکل حرام قرار دیا ہے۔ یعنی گانے بجانے کے ذریعہ انسان کی روحانی لذت" کا سامان فراہم ہونے لگا۔ اس سلسلہ میں ۲۰ جون ۱۹۳۳ء کے اخبار "وقت" میں جو فرمان شائع ہوا وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ اس میں کہا گیا ہے:

"تیسری ضرورت طریق عبادت میں تغیر کی ہے ہمیں ایسے ذرائع و وسائل اختیار کرنے چاہئیں۔ جن سے پرستش خداوندی بڑی دلچسپ، پُرکشش اور رُوح افزا بن جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ ہم گویوں اور اماموں کا ایک ایسا گروہ تیار کریں جو فنِ موسیقی کے اسرار و رموز سے پوری طرح واقف ہو۔ اس لیے ہمارے معابد میں آلاتِ موسیقی کا وجود بے حد ضروری ہے۔ مخصوصاً وہ آلات جو جدید طرز کے اور مقدس ہیں" (یعنی جو کلیساؤں میں استعمال ہونے کی وجہ سے مقدس ہو گئے ہیں)

یہ تبدیلی کچھ اس وجہ سے نہ تھی کہ مصطفیٰ واقعی ترک قوم کی نمازوں میں روحانی سرور پیدا کرنے کا خواہشمند تھا بلکہ اس سے اصل مقصود نماز کی اسپرٹ کو ختم کرنا اور مسلمانوں کی عبادت کو اہلِ مغرب کی عبادت سے مشابہ بنانا اور مسجد سے مسلمانوں کے تعلق کو وہی رنگ دے دینا تھا جو چرچ سے اہل مغرب کے تعلق کا ہے۔

لیکن اس کا حاصل بجز قوم کے اجتماعی ضمیر اور قوم کے فرمانرواؤں کے درمیان کشمکش بڑھانے کے سوا اور کچھ نہ ہوا۔ قوت اور ذرائع و وسائل کا اچھا خاصا حصہ اس احمقانہ اسکیم کو نافذ کرنے میں برباد ہوا اور آخر کار ترک قوم کے شعور کو اس بات پر کسی طرح راضی نہ کیا جا سکا کہ وہ اپنی مسجدوں کو کلیساؤں کے سانچے میں ڈھال لے۔

تہذیب و تمدن کو اس طرح تبدیل کرنا کوئی کھیل نہ تھا جو یونہی دوا دوی میں بغیر کسی شدید محنت کے سرانجام پا جاتا۔ یہ ایک بڑا ہی سخت کام تھا جسے برسوں کی مسلسل مشقت اور ایک نہایت ہی ہولناک ظلم و ستم کی مدد سے پایۂ تکمیل کو پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ ایسا ہونا بالکل ایک فطری امر تھا۔ کیونکہ اس انقلاب کا مقصد لوگوں کے صدیوں کے تصورات کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر ان کی جگہ بالکل نئے تصورات اور اعتقادات کو رواج دینا تھا۔ اس کے پیچھے زبردست عزائم کارفرما تھے، اسے لانے کے لیے زرِ کثیر خرچ کیا گیا، اس کے راستے میں جو قوتیں مزاحم ہوتیں انہیں کچل کے رکھ دیا گیا، تب کہیں جا کر ترکی قوم کے لباس اور زبان کو تبدیل کیا جا سکا۔

جن لوگوں نے حالات کا بالکل سطحی مشاہدہ کیا انہوں نے یہ گمان کر لیا کہ یہ تبدیلی جو جبراً لائی گئی ہے کسی انقلابِ فکر و نظر کا نتیجہ ہے۔ اس تجربے سے ان زعماء قوم کو بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اسلامی تہذیب و تمدن کو مٹانے اور مغربی تہذیب کو اپنانے کی یہ کوششیں اس قوم کے سارے مسائل کو حل کر دیں گی اور یہ قوم اب اسی راہ پر چلتی رہے گی جس پر انہوں نے اسے ڈال دیا ہے مگر مغربی تہذیب و تمدن کا پودا یہاں پوری طرح بار آور ہونے بھی نہ پایا تھا کہ اس سے بے اطمینانی کے آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے۔ اس شجرِ خبیث نے جو پھل ترکی قوم کی جھولی میں گرائے ہیں وہ اتنے تلخ اور کڑوے ہیں

کہ اس نے خود اس شجر کی آبیاری کرنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے اور اب وہ دوسرے انداز سے سوچنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں اس کے ساتھ انہیں اب اس امر کا پورا احساس ہو رہا ہے کہ ایک مسلمان قوم کے دل و دماغ میں کسی غیر اسلامی تہذیب کی جڑیں مضبوطی سے گاڑی نہیں جا سکتیں ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اب ترکی میں اس تہذیب کے خلاف ایک رد عمل شروع ہو رہا ہے ، اور اس رد عمل کی شہادت بھی ہم اس پادری ہی کے مضمون سے پیش کرتے ہیں جس نے بڑے رنج و افسوس اور احساس خطر کے ساتھ بیان کیا ہے ۔

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ اتاترک کی ساری کوششوں کے باوجود ترکی قوم اسلام کو خیرباد کہنے پر آمادہ نہ ہوئی وہ اس سے ہمیشہ وابستہ رہنا چاہتی تھی اور اس بنا پر وہ ہر آن اس بات کے لئے کوشاں رہی کہ اس دین سے اس کا تعلق کسی نہ کسی صورت قائم ضرور رہے اس سے ۱۹۲۵ء میں اس بات کا اہتمام کیا کہ کسی طرح کم از کم ایک دو دینی مراکز اس "طفل نادان" اور اس کے انجان ساتھیوں کی دستبرد سے بچا لئے جائیں ۔ چنانچہ وہ شعبۂ امور مذہبی کے تحت صرف ایک دینی مدرسہ کو محفوظ رکھنے میں کامیاب ہوئی جس میں قرآن کی تعلیم کا انتظام تھا ۔ اس مدرسے کو حکومت کی طرف سے ایک پائی کی امداد بھی حاصل نہ تھی ۔ یہاں کے فارغ التحصیل لوگوں کے لیے سرکاری ملازمتوں کے سارے دروازے بند اور ترقی کی ساری راہیں مسدود تھیں پھر پوری قوم کو میخانۂ مغرب سے جام پلا پلا کر بدمست کر دیا گیا تھا ۔ لیکن ان حالات میں بھی بعض لوگ ایسے سخت جان نکلے جنہوں نے دنیاوی فوائد کو یکسر ٹھکراتے ہوئے محض آخرت کی خاطر اس مدرسہ سے کتاب الٰہی اور سنت رسول کی تعلیم حاصل کی اور ان لوگوں کی مساعی میں خداوند تعالیٰ نے اس قدر برکت عطا کی کہ بہت جلد ہی لوگوں کے دلوں میں دینی تعلیم کی ضرورت کا احساس بڑھنے لگا ۔ اس کا اندازہ مذکورہ بالا مدرسے کے متعلق مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے آسانی لگایا جا سکتا ہے

سال	تعداد اسباق	تعداد اساتذہ	تعداد طلبہ	تعداد طالبات	کل تعداد
۱۹۲۵ء	۱۰	۹			۲۵

کل تعداد	تعداد طالبات	تعداد طلبہ	تعداد اساتذہ	تعداد اسباق	سال
۲۳۲			۹	۹	۱۹۴۴ء
۲۷۶۵	۷۴۴	۲۰۲۱	۶۵	۶۱	۱۹۴۵ء
۵۵۳	۱۴۸۸	۴۰۴۲	۱۳۰	۱۲۲	۱۹۴۸ء
۸۷۰۶	۲۳۰۳	۶۴۰۴	۱۳۰	۱۲۷	۱۹۴۹ء

یہ تو ہے دینی تعلیم میں طلبا کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کا حال - اب رہے وہ مدارس جو صرف مغربی تہذیب و تمدن کو ترقی دینے کے لئے قائم کیے گئے تھے اور جنہیں مذہبی تعلیم سے بالکل خالی رکھنے کا اہتمام کیا گیا تھا وہاں بھی حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر آخر کار مذہبی تعلیم کو لازمی قرار دینا پڑا اور آج طلبہ بڑے ذوق و شوق سے اسے حاصل کرتے ہیں -

---

جدید مدارس میں دینی تعلیم کا اجرا تین محرکات کا نتیجہ ہے ان میں سب سے پہلا محرک یہ تھا کہ طلبہ کی اخلاقی حالت بڑی سرعت کے ساتھ بگڑ رہی تھی اور ترکی پارلیمنٹ تک یہ شکایت کی جانے لگی تھی کہ نئی نسلوں کے دل سے والدین کا ادب و احترام ختم ہوتا جا رہا ہے - دوسرے ترکی فوج نے اس بات کا مطالبہ کیا کہ اسے نماز پڑھانے اور اسلامی تعلیمات سے روشناس کرنے کے لیے اماموں کی ضرورت ہے - تیسرے ترکوں میں یہ عام احساس پیدا ہونے لگا کہ روسی کمیونزم کی تبلیغ کے مقابلے میں اگر ترک نوجوانوں کو اسلام کی تعلیم نہ دی گئی تو روس کے کسی حملے کے بغیر ہی ترکی محض کمیونزم کی تبلیغ کے ذریعہ روس کے لئے مسخر ہو جائے گا - ان حالات کی بنا پر حکومت کو اپنی تعلیمی پالیسی بدلنی پڑی -

ترکی عوام نے جس گرمجوشی کے ساتھ اس نئی پالیسی کا خیر مقدم کیا اس کا اندازہ لگانے کے لیے صرف ایک مثال کافی ہے - حکومت کی طرف سے جب سرکاری مدارس میں دینی تعلیم کی اوّل اوّل اجازت دی گئی تو ساتھ یہ شرط بھی عائد کر دی گئی کہ دینیات پڑھنے کے لئے طلبہ کو اوقاتِ مدرسہ کے بعد ٹھیرنا ہوگا اور جو اساتذہ اسے پڑھانا چاہیں وہ بھی کسی معاوضہ کی توقع کے بغیر ہی پڑھائیں - ان دشواریوں کے باوجود

بے شمار اساتذہ اور طلبا، اس کے لیے تیار ہو گئے۔ آخرکار وزیر اعظم کو اپنی پالیسی میں مزید تغیر کرنے ہوکے یہ اعلان کرنا پڑا۔

"نئی حکومت ابتدائی مدارس میں مذہبی تعلیم کے سوال پر غور کرے گی تاکہ مذہبی آدمیوں کو صحیح طور پر تربیت دی جا سکے۔ یہ ہماری قوم کا تقاضا ہے۔"

۱۰ اکتوبر سنہ ۱۹۵۰ء میں پانچویں اور چھٹے درجے میں مذہبی تعلیم لازمی قرار دے دی گئی۔ لیکن قانون میں اس امر کی پوری گنجائش تھی کہ جو والدین اپنے بچوں کو اس سے مستثنیٰ رکھنا چاہیں انہیں اس کا پورا اختیار ہوگا۔ جب والدین سے اس معاملہ میں رجوع کیا گیا تو ۹۰ فیصدی لوگوں نے اس تعلیم کے حق میں رائے دی۔

اسی طرح وہاں مذہب کے بارے میں نوجوان لڑکوں کے احساسات معلوم کرنے کے لیے ۶۲ بچوں سے اپریل سنہ ۱۹۵۶ء میں انٹرویو لیے گئے۔ ان سے پتہ چلا کہ ۸۹ سے لے کر ۹۴ فیصد بچے مذہب کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ۷۰ سے لے کر ۸۹ فیصد کا مذہب پر پختہ ایمان ہے۔ مذہب کے حق میں اس عام رجحان کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مساجد میں نمازیوں کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ جب نوجوانوں سے ان کے تاثرات معلوم کرنے کی کوشش کی گئی تو ان میں سے ۷۰ فیصد نے اس تبدیلی کو خوش آئند کہا۔ ترکی کی بھاری اکثریت اس بات پر پورا یقین رکھتی ہے کہ اسلام ہمارے جدید تقاضوں کو بڑی خوش اسلوبی سے پورا کر سکتا ہے۔

یہ سارے واقعات جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ اس بات کی زندہ شہادت ہیں کہ ترکی قوم اب پھر مذہب کی طرف متوجہ ہو رہی ہے اور دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد اسے اس بات کا احساس ہو چکا ہے کہ مذہب سے اس کا انحراف کسی طرح بھی اس کے لئے مفید ثابت نہیں ہوا۔

اتاترک اور اس کے ساتھیوں کی کوششوں کا یہ حشر دیکھ کر ایک انسان کے دل میں قدرتی

ذہن پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کی بے شمار قومیں ایسی ہیں جنہوں نے جب ایک دفعہ مذہب کو ترک کیا تو پھر کبھی دوسرے سے بھی اس کا نام نہ لیا۔ لیکن یہ ملت باوجود ہزار جد و جہد کے بھی من حیث القوم اپنے مذہب کو ترک کرنے کے لیے تیار نہ کی جا سکی۔

اس کی سب سے بڑی وجہ صرف یہ ہے کہ دوسری اقوام نے اپنی قومیت کی تشکیل خالص مادی بنیادوں پر کی ہے یعنی رنگ، نسل، زبان، سیاسی اور معاشی۔ مدت سے قومیت کا [illegible]اُٹھایا گیا ہے۔ ان میں سے بے شمار قومیں ایسی بھی ہیں جو مادیت کو نہایت حقارت کی نگاہوں سے دیکھتی ہیں لیکن قومیت کے بنانے میں انہوں نے بھی خاک و خون ایسے مادی رشتوں کا ہی سہارا لیا ہے۔ مذہب خواہ وہ اس کی کتنی ہی عزت و توقیر کرتے ہوں۔ لیکن ان کے ہاں وہ ایک ایسی قوت نہیں جو انہیں ایک دوسرے سے جوڑ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی اجتماعی زندگی میں اپنے مذہبی معتقدات کو کسی طرح بھی اثر انداز نہیں ہونے دیتے۔ مذہب کے معاملہ میں ان کا رویہ بالعموم غیر جانبدارانہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ ایک ثانیہ کے لیے کسی ایسی چیز کو برداشت نہیں کر سکتے جس کی زد اُن کی قومیت پر پڑے۔

ملت اسلامیہ کا معاملہ دنیا کی ساری قوموں سے بالکل مختلف ہے۔ اس نے دنیا اور اس کے متعلقات سے اپنے ماننے والوں کے اندر کوئی نفرت تو پیدا نہیں کی۔ لیکن حیاتِ اجتماعی کی تشکیل میں کسی مادی رشتے سے قطعاً کوئی کام نہیں لیا۔ اس نے یہ کام صرف چند اعتقادات سے لیا ہے۔ اس بنا پر مسلم قومیت کی بنیاد نہ اشتراکِ زبان پر رکھی گئی ہے، نہ اشتراکِ رنگ و نسل اور نہ ہی اشتراکِ وطن پر۔ بلکہ سارے مسلمان اس برادری میں جو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی اس لیے شریک ہیں کہ "مظاہرِ کائنات کے متعلق ان سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے"۔

اس بنیادی فرق کو سمجھ لینے کے بعد اب آپ اس حقیقت کو آسانی کے ساتھ جان سکتے ہیں کہ مسلمان مذہب کو خیرباد کہنے پر کیوں تیار نہیں ہو سکتا۔ وہ کیوں ان لوگوں کے ساتھ تعاون نہیں کرتا جو اسے اس سے

دُور لے جانے کی کوشش کرتے ہیں؟ وہ کیوں اُن سب حضرات کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو اس کا ماضی سے رشتہ منقطع کرتے ہیں؟ اس کی وجہ نہایت ظاہر ہے۔ ہمارا مذہب ہماری حیاتِ اجتماعی میں صرف ایک عنصر کی حیثیت سے شامل نہیں بلکہ یہ ہماری زندگی کا مبدا اور اساس ہے اس لئے ہم مذہب کو خیرباد کہہ کر ایک قوم کی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتے۔ ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ ہم جیتے جی مذہب سے منہ موڑ کر کسی دوسرے طریقِ فکر کے مطابق کام کر سکیں یا اجتماعی زندگی کی کوئی ایسی شکل گوارا کر لیں جو ہمارے مذہبی احساسات و تخیلات سے بالکل مغائر ہو۔ مذہب کا وجود ہی ہماری زندگی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ دنیا کا کون سا ایسا بیوقوف ہے جو خود اپنے ہاتھ سے اپنی قبر کھودنے پر تیار ہو جا سکے۔

ہماری قوم میں سے جب کبھی کوئی شخص نئے عزائم اور ولولے لے کر اٹھتا ہے تو ہم کچھ دیر اس کے ساتھ چلتے ہیں۔ لیکن ہمیں جونہی یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمیں مذہب سے دُور لے جانا چاہتا ہے تو ہم فوراً اس سے کھسک جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہمارا دلی تعاون ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس منزل سے دُور ہٹ جانے کے بعد خود ہماری زندگی بھی ختم ہو جائے گی۔ اسی وجہ سے اگر ہم آج ایک شخص کے پیچھے چلتے ہیں، تو کل دوسرے کے۔ ہم ہر روز اپنے لئے نئے نئے راہنما تلاش کرتے ہیں اور پھر ان سے جلد مایوس ہو کر انہیں چھوڑتے بھی جاتے ہیں۔ ہماری حالت غالب کے اس مسافر کی سی ہے جس کے متعلق اس نے کہا تھا ؎

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ہماری اس سیمابی کیفیت نے ہمیں سخت نقصان پہنچایا ہے اس سے ہماری صلاحیتیں اور قوتیں ضائع ہوتی ہیں خدا کرے کہ اس قوم کے سربراہ اس قوم کے مزاج کو سمجھ لیں اور اس طرح اس کے فکر و احساس کی لہروں میں انتشار و اختلال کی بجائے پھر سے ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔

تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل

(۴)

ایک بڑی غلط فہمی | مطالبۂ دستورِ اسلامی کی اس جدوجہد کو بعض لوگ اس معنی میں لے لیتے ہیں کہ ہم نے فطری طریقِ انقلاب کو چھوڑ کر مصنوعی طریقے سے ایک اسلامی ریاست بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ یعنی ان کے نزدیک ہماری اس جدوجہد کا منشا بس یہ تھا کہ دستور ساز اسمبلی ہمارے کہنے کے مطابق اسلامی اصولوں پر ملک کا ایک دستور بنا دے، اور جب وہ ایسا کر دے گی تو وہ مطلوب چیز وجود میں آجائے گی جسے ہم اسلامی ریاست و حکومت کہتے ہیں، خواہ معاشرہ اُسی جاہلیت میں مبتلا رہے جس میں وہ پہلے مبتلا تھا۔ اس غلط فہمی کی بنا پر وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اس موقع پر نظامِ حکومت کی اصلاح کے لیے جو قدم اٹھایا وہ بالکل غلط سمت میں تھا، اور اُس طریقِ انقلاب کے بھی خلاف تھا جو ہم خود تقسیم سے پہلے بیان کیا کرتے تھے۔ اُس طریقِ انقلاب کے مطابق تو نظامِ حکومت کی صحیح اور حقیقی تبدیلی صرف وہی ہو سکتی تھی جو معاشرے کی ذہنی و اخلاقی تبدیلی کے نتیجہ میں رونما ہو۔ لیکن اب ہم معاشرے کی تبدیلی کے بغیر ہی نظامِ حکومت محض ایک دستور ساز اسمبلی کے ذریعہ سے تبدیل کرانے پر آمادہ ہو گئے، حالانکہ یہ اسمبلی معاشرے کے بگاڑ کی نمائندہ تھی، اور ان بگڑے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں کسی اصلاح کا امکان نہ تھا۔ نہ اس امر کا کوئی امکان تھا کہ اس جمہوری نظام میں فاسد معاشرے سے صالح لوگ منتخب ہو کر آئیں اور اصلاح کا کوئی کام کر سکیں۔

یہ بعینہٖ وہی اعتراض ہے جس سے ہمیں مطالبہ نظامِ اسلامی کے آغاز ہی میں لادینی ریاست کے داعیوں کی طرف سے سابقہ پیش آیا تھا۔ ۱۹۴۸ء کے اوائل میں جب پہلی مرتبہ یہ آواز اُٹھائی گئی

کہ پاکستان کو ایک اسلامی ریاست ہونا چاہیئے، تو اُن سب لوگوں نے جو اسے ایک لادینی ریاست دیکھنا اور بنانا چاہتے تھے طرح طرح کے بہانوں اور اعتراضات سے اس آواز کو دبانے کی کوشش کی۔ مثلاً انہوں نے کہا کہ اگر یہاں اسلامی قانون جاری ہوگا تو لاکھوں آدمیوں کے ہاتھ کٹ جائیں گے۔ مگر یہاں ہم اپنی مذہبی حکومت قائم کریں گے تو ہندوستان میں ہندو بھی اپنی مذہبی حکومت قائم کر دیں گے۔ اگر یہاں ہم نے ایک مذہبی حکومت قائم کی تو ہم دنیا بھر میں نکّو بن جائیں گے۔ لیکن سب سے زیادہ زور دار بہانا جو یہ لوگ بنا کر لائے تھے وہ یہ تھا کہ بھائی، پہلے معاشرہ تو اسلامی ہو، پھر حکومت بھی آپ سے آپ اسلامی ہو جائے گی، اس بگڑے ہوئے معاشرے میں تم اسلامی حکومت کہاں قائم کرنے چلے ہو۔ اس موقع پر میں آپ کو وہ مکالمہ یاد دلاؤں گا جو مئی ۱۹۴۸ء میں خود مجھ سے ریڈیو پر کیا گیا تھا۔ اس میں لادینی نظریے کے نمائندے کا استدلال یہ تھا:

"ہر ملک کا سیاسی نظام اُس کے باشندوں کے رسم و رواج، اخلاق، عادات، خصائل اور اعتقادات و توہمات کا پرتو ہوتا ہے۔ ریاستی نظام بجائے خود کسی فلسفے یا مذہب کا حامل نہیں ہو سکتا۔ اگر اسے ایسا بنانے کی کوشش کی جائے تو وہ ایک مصنوعی اور عارضی کوشش ہوگی۔ ۔ ۔ اگر ہم اسلامی ریاست کی تعمیر چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ پاکستان کے باشندوں میں صحیح اسلامی اسپرٹ پیدا کریں اور انہیں دین کی اصلی اقدار سے روشناس کرائیں۔ جب یہ اقدار مضبوط ہو جائیں گی اور ہمارے قومی کیریکٹر میں اسلامی تصوّرات پوری طرح سرایت کر جائیں گے، اس وقت ہمارا سیاسی نظام خود بخود اسلامی رنگ اختیار کر لے گا۔ ہم اس وقت تک اسلامی ریاست کی داغ بیل نہیں ڈال سکتے جب تک ہماری روحانی، شخصی اور سماجی زندگی میں اسلامی روایات پوری تابندگی سے جلوہ گر نہ ہوں۔ میری نظر میں وہ وقت ابھی بہت دور ہے۔ جب ہم مکمل اسلامی تصوّرات قبول کر لیں گے۔ اس لئے اسلامی ریاست کو قائم کرنے کی کوششیں قبل از وقت ہیں۔"[1]

---

[1] ترجمان القرآن جون ۱۹۴۸ء

یہ وہ سب سے زیادہ دلفریب پھندا تھا جس میں ہمیں پھانسنے کی کوشش کی گئی تھی۔ سنہ ۴۷ء میں ان لوگوں کا استدلال یہ تھا کہ پہلے مسلمانوں کی ایک قومی ریاست قائم ہو جانے دو، پھر اسے اسلامی ریاست میں تبدیل کرنے کی کوشش کر لینا۔ اس دلیل سے انہوں نے فطری انقلاب کے اُس راستے کو قبول کرنے سے انکار کیا جس پر چل کر مسلمانوں کی قومی ریاست کا قیام اور اسلامی ریاست کا قیام آپ سے آپ ایک ساتھ واقع ہوتا۔ اب جب کہ وہ قومی ریاست قائم ہو گئی تو ان کا دوسرا استدلال یہ تھا کہ اس وقت چونکہ معاشرہ اسلامی نہیں ہے، اس لیے یہاں ایک لادینی جمہوری ریاست ہی قائم ہونی چاہیے۔ تم اسلامی ریاست چاہتے ہو تو معاشرے کو بدلنے کی کوشش کرو۔ جب وہ بدل جائے گا تو ریاست بھی بدل جائے گی۔ بالفاظ دیگر ان کا مطلب یہ تھا کہ اس قومی ریاست کو تو معاشرے کی تعمیر لادینی کے اصولوں پر کرنے دو، اور تم اُسی طرح اختیارات اور وسائل کے بغیر اسلامی معاشرہ تیار کرتے رہو جس طرح قومی ریاست کے وجود میں آنے سے پہلے اجنبی تسلط کے دور میں کر رہے تھے۔ تعجب یہ ہے کہ اُس وقت تو لادینی کے حامی ہمیں اس پھندے میں پھانسنا چاہتے تھے، مگر اب خود دینی نظام کے بعض حامی ہم سے کہتے ہیں کہ تم اس پھندے میں پھنس کیوں نہ گئے؟

اس معاملے میں ساری غلط فہمیوں کی بنیاد یہ ہے کہ یہ لوگ نہ تقسیم سے پہلے کی پوزیشن اچھی طرح سمجھتے ہیں نہ تقسیم کے بعد کی پوزیشن، اور نہ یہی جانتے ہیں کہ ان دونوں زمانوں میں ہم نے جو کچھ کہا اور کیا اس کا حاصل اور مدعا کیا تھا۔

تقسیم سے پہلے ہم نے فطری انقلاب کا راستہ ایک ایسی مسلمان قوم کے سامنے پیش کیا تھا جو حکومت کے اختیارات نہیں رکھتی تھی، بلکہ حصولِ اختیار کے لیے کوشش کرتے اُٹھ رہی تھی۔ نیز وہ اپنی منزل مقصود اسلامی ریاست بتاتی تھی مگر غلط راستے سے اس کی طرف جانا چاہتی تھی۔ ہم نے اسے بتایا کہ اس منزل تک جانے کا فطری راستہ یہ ہے۔ اس راستے سے آگے بڑھو گے تو اختیارات کا حصول اور اسلامی ریاست کا قیام، دونوں بیک وقت واقع ہوں گے، بالکل اسی طرح جیسے درخت کا بلوغ اور اس میں پھل آنا، دونوں ایک ساتھ طبعی نتیجے کے طور پر واقع ہوتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے،

اس وقت ہماری یہ تجویز مقبول نہ ہو سکی، مسلمان اپنی پوری اجتماعی طاقت صرف حصولِ اختیار کی کوشش پر صرف کرتے رہے، اور بس ہم چند آدمی ہی اس فطری راستے سے انقلاب لانے کی سعی کے لیے رہ گئے۔

تقسیم کے بعد جس چیز سے ہم دوچار ہوتے وہ یہ تھی کہ وہی بے اختیار قوم جسے ہم نے فطری انقلاب کا وہ راستہ دکھانا چاہا تھا، ایک مصنوعی انقلاب کے ذریعہ سے یکلخت با اختیار ہو گئی بغیر اس کے کہ اس کے سامنے کوئی واضح نصب العین ہوتا اور اس نصب العین کے مطابق سیاسی انقلاب کے ساتھ کوئی ذہنی، اخلاقی اور اجتماعی انقلاب بھی رونما ہوا ہوتا۔ اب لامحالہ با اختیار ہو جانے کے بعد اس قوم کو اپنے لیے ایک نظریۂ زندگی اختیار کرنا تھا جس پر وہ اپنی تعمیرِ نو کا آغاز کرتی، جس کے مطابق وہ اپنی تعمیر کے کام میں ملک کے وسائل اور حکومت کے اختیارات استعمال کرتی، جس کے لحاظ سے مردانِ کار تیار کرنے کے لیے وہ تعلیم و تربیت کا انتظام کرتی، جس کے نقشے پر وہ اپنی حیاتِ اجتماعی کی تشکیل اور معاملاتِ زندگی کی انجام دہی کے لیے قوانین بناتی۔ یہ اس قوم کے استعمالِ اختیارات کا وقتِ آغاز تھا اور اسے طے کرنا تھا کہ وہ اپنے ان اختیارات کو کس مقصد کے لیے کس چیز کی تعمیر اور کس چیز کی تخریب میں استعمال کرے۔

اس وقت دو طرح کے امکانات قریب قریب مساوی حیثیت میں موجود تھے۔ ایک امکان اس امر کا تھا کہ یہ مسلمان قوم لادینی قومی ریاست کے راستے پر مڑ جائے اور اس مصنوعی انقلاب کی تکمیل اس بدترین شکل میں ہو جس کا نقشہ کھینچ کھینچ کر ہم تقسیم سے پہلے اپنی قوم کو اس راستے کے خطرات سے آگاہ کیا کرتے تھے۔ ایک طاقتور گروہ جس کے ہاتھ میں اختیارات کی کنجیاں بھی تھیں، اس قوم کو اسی راستے پر ڈالنے کے لیے زور لگا رہا تھا، اور اس کوشش میں تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے، دوسرے امکان کے دروازے جلدی سے جلدی بند کر دیے جائیں۔ دوسرا امکان یہ تھا اور اس کے لیے اچھے خاصے مواقع موجود تھے کہ اس قوم کو اسلامی ریاست کے راستے پر ڈالا جائے اور لادینی کی جڑیں اس کے معاشرے میں نہ جمنے دی جائیں۔

اس پس منظر کو نگاہ میں رکھ کر اب ملاحظہ فرمائیے کہ جس وقت ہم ۱۹۴۸ء میں دستورِ اسلامی کی

جدوجہد کے لیے اُٹھ رہے تھے اُس وقت ہم نے اُن لوگوں کے استدلال کا کیا جواب دیا تھا جو کہتے تھے کہ سردست تو ایک لا دینی جمہوری ریاست بن جانے دو، پھر جوں جوں معاشرہ اسلامی بنتا جائیگا، ریاست بھی اسلامی ہوتی چلی جائیگی - ابھی ریڈیو کے جس مکالمے کا میں نے ذکر کیا ہے، اس میں جانبِ مخالف کی بات کا جواب دیتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا

آپ نے سچ فرمایا کہ ایک ملک کا نظام اس کے باشندوں کی اخلاقی و ذہنی حالت کا پرتو ہوتا ہے۔ اب اگر پاکستان کے باشندے اسلام کی طرف ایک پُر زور میلان رکھتے ہیں اور ان کے اندر اسلام کے راستے پر آگے بڑھنے کی خواہش موجود ہے تو آخر ان کی قومی ریاست اُن کے اس میلان اور خواہش کا پرتو کیوں نہ ہو؟ آپ کا یہ ارشاد بھی بالکل درست ہے کہ اگر ہم پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں پاکستان کے باشندوں میں اسلامی شعور، اسلامی ذہنیت اور اسلامی اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے - مگر میں نہیں سمجھا کہ آپ اس کوشش میں حصہ لینے سے خود ریاست کو کیوں مستثنیٰ رکھنا چاہتے ہیں - ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کی صورتِ حال تو یہ تھی کہ ہمارے اوپر ایک غیر مسلم اقتدار مسلط تھا، اس وجہ سے ہم اسلامی خطوط پر اپنی ملت کی تعمیر میں ریاست اور اس کی طاقتوں اور اس کے ذرائع سے کوئی مدد نہیں پا رہے تھے، بلکہ درحقیقت اس وقت ریاست کا پورا ادارہ اپنے زور سے ہمیں دوسری طرف کھینچے لیے جا رہا تھا اور ہم انتہائی ناساز گار حالات میں اسلامی زندگی کی تعمیر کے لیے جدوجہد کر رہے تھے - اب جو سیاسی انقلاب ۱۵ اگست کو رونما ہوا ہے اس کے بعد ہمارے سامنے یہ سوال پیدا ہو گیا ہے کہ آیا ہماری قومی ریاست اسلامی زندگی کی تعمیر میں وہ حصہ لے گی جو ایک معمار کا حصہ ہوتا ہے، یا وہ طرزِ عمل اختیار کریگی جو ایک بے نیاز غیر جانبدار کا ہوا کرتا ہے، یا اب بھی وہی پچھلی صورتِ حال برقرار رہے گی کہ ہمیں حکومت کی مدد کے بغیر بلکہ اس کی مزاحمت کے باوجود اسلامی تعمیر

کا کام کرنا ہوگا؟ اس وقت چونکہ پاکستان کا آئندہ نظام زیرِ تشکیل ہے اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ ایسی ریاست بن جائے جو اسلامی زندگی کی معمار بن سکے۔ ہماری یہ خواہش اگر پوری ہوگئی تو ریاست کے وسیع ذرائع اور طاقتوں کو استعمال کر کے پاکستان کے باشندوں میں ذہنی اور اخلاقی انقلاب برپا کرنا بہت زیادہ آسان ہو جائیگا۔ پھر جس نسبت سے ہمارا معاشرہ بدلتا جائے گا اُسی نسبت سے ہماری ریاست بھی ایک مکمل اسلامی ریاست بنتی چلی جائے گی۔"

اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ اس کا جواب میں نے اپنی اُس تقریر میں دیا تھا جو فروری ۱۹۴۸ء میں لا کالج لاہور میں کی گئی تھی۔ میں نے اس میں کہا تھا:

"میں ان سے پوچھتا ہوں کہ یہ ماحول (یعنی اسلامی ماحول جس کے تیار ہونے پر اسلامی ریاست کی بنا ڈالنا موقوف قرار دیا جاتا ہے) تیار کون کرے گا؟ کیا ایک بے دین ریاست جس کی باگیں فرنگیت زدہ حکام اور لیڈروں کے ہاتھ میں ہوں؟ .... اگر ان کا مطلب یہی ہے تو انسانی تاریخ میں یہ پہلا اور بالکل نرالا تجربہ ہوگا کہ بے دینی خود دین کو پروان چڑھا کر اپنی جگہ لینے کے لیے تیار کرے گی! اور اگر ان کا مطلب کچھ اور ہے تو وہ ذرا صاف صاف اس کی توضیح فرمائیں کہ اسلامی ماحول کی تیاری کا کام کون، کس طاقت اور کن ذرائع سے کرے گا اور اس دوران میں بے دین ریاست اپنے ذرائع اور اقتدار کو کس چیز کی تعمیر میں صرف کرتی رہے گی؟ .... اسلامی نظام زندگی کی تعمیر ہو یا غیر اسلامی زندگی کی، اگرچہ وہ ہوتی تو تدریجی ہی ہے، لیکن تدریجاً اس کی تعمیر صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب کہ ایک معمار طاقت اپنے سامنے ایک مقصد اور ایک نقشہ رکھ کر مسلسل اس کے لیے کام کرے .... یہ پاکستان جب اسلام کے نام سے اور اسلام کے سبب مانگا گیا ہے اور اسی بنا پر ہماری یہ مستقل ریاست قائم

ہوئی ہے تو ہماری اس ریاست ہی کو وہ معمار طاقت بننا چاہیے جو اسلامی زندگی کی تعمیر کرے۔ اور جب کہ یہ ریاست ہماری اپنی ریاست ہے اور ہم اپنے تمام قومی ذرائع و وسائل اس کے سپرد کر رہے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس تعمیر کے لیے کہیں اور سے ذرائع اور معمار فراہم کرتے پھریں "۔

" یہ بات اگر صحیح ہے تو پھر اس تعمیر کی راہ میں پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنی اس ریاست کو جو ابھی تک انگریز کی چھوڑی ہوئی کافرانہ بنیادوں پر قائم ہے، مسلمان بنائیں ... اس کے بعد ہی صحیح طور پر ہمارے راستے دھندوں کو یہ معلوم ہوگا کہ اب انہیں کس مقصد اور کس کام کے لیے اپنے نمائندے منتخب کرنے ہیں ... ... دوسرا قدم یہ ہے کہ جمہوری انتخاب کے ذریعہ سے اس ریاست کی زمامِ کار ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو جو اسلام کو جانتے بھی ہوں اور اس کے مطابق ملک کے نظامِ زندگی کو ڈھالنا چاہتے بھی ہوں۔ اس کے بعد تیسرا قدم یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ہمہ گیر اصلاح کا ایک منصوبہ بنایا جائے اور اسے عمل میں لانے کے لیئے ریاست کے تمام ذرائع و وسائل استعمال کیے جائیں "۔[۵]

اُسی زمانے میں مولانا امین احسن صاحب نے اپنی ایک تقریر میں وضاحت کے ساتھ یہ بتایا تھا کہ اگر پاکستان کی قومی ریاست ایک لادینی ریاست بن گئی تو اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ انھوں نے فرمایا تھا:

"جہاں تک مذہب کا تعلق ہے، ایک لادینی جمہوری ریاست کی طرف سے اس کے ساتھ دو ہی طرح کے سلوک کی توقع کی جا سکتی ہے۔ یا تو وہ چشم پوشی اور اغماض کا سلوک کرے گی، یا عناد کی پالیسی اختیار کرے گی۔ تجربہ بتاتا ہے کہ

---

۵ " اسلامی قانون " صفحہ ۳۷ - ۳۹

یہ دونوں طرح کے سلوک لادینی حکومتیں دو مختلف طرح کے حالات میں اختیار کرتی ہیں۔ جن ملکوں میں مذہبی احساس کمزور ہوتا ہے وہاں لادینی حکومتیں بالعموم چشم پوشی کی پالیسی اختیار کرتی ہیں اور پیشِ نظر یہ بات ہوتی ہے کہ نظامِ غالب کے تحت یہ خفیف مذہبی احساس خود اپنی موت مر جائے گا، اس کو مارنے کے لئے ہتھیار اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن جہاں مذہبی شعور قومی اور مذہبی ادارے طاقتور ہوں اور لادینی حکومت محسوس کرتی ہو کہ اس کی جڑیں اس زمین میں اس وقت تک پوری طرح نہیں جم سکتیں جب تک مذہبی جڑیں اکھاڑ نہ دی جائیں، وہاں وہ پوری طاقت کے ساتھ اس بات کی کوشش کرتی ہے کہ مذہب کا نام و نشان بھی باقی نہ چھوڑے۔ میرا اندازہ ہے کہ پاکستان کے حالات اسی طرح کے ہیں۔ اس وجہ سے اگر اس ملک میں کسی لادینی ریاست کے قیام کا فیصلہ ہوا تو اس کی تعمیر۔ مذہب کی تخریب کے بعد ہی ممکن ہو سکے گی اور لادینیت کے ائمہ مجبور ہوں گے کہ اس سرزمین کو تمام مذہبی آثار اور محرکات سے اسی طرح صاف کر دیں جس طرح کمال اتاترک اور اس کے ساتھیوں نے ترکی کو تمام مذہبی باقیات سے صاف کر دیا تھا۔[1]

اس تشریح سے آپ بخوبی اندازہ کر سکتے کہ جن حالات میں ہم نے اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے مطالبۂ دستورِ اسلامی کو نقطۂ آغاز کی حیثیت سے منتخب کیا تھا ان میں پیش قدمی کا یہی ایک راستہ صحیح تھا۔ فطری طریق انقلاب کا یہ تصور کہ وہ کوئی ایسا لگا بندھا طریقہ ہے جو ہر جگہ ہر طرح کے حالات میں ایک ہی ڈھنگ پر چلنا چاہیے، سراسر ایک غیر معقول تصور ہے۔ ایک نئی نئی آزاد ہونے والی مسلمان قوم کے اندر انقلاب لانے کا فطری اور معقول راستہ وہ نہ تھا جس پر قبل تقسیم کے حالات میں ہم کام کر رہے تھے، بلکہ یہ تھا کہ ہم آگے بڑھ کر اسے اپنی آزادی و خود مختاری کے استعمال کی صحیح صورت بتائیں، اس کو دوسری گمراہ کن تحریکوں کے اثر میں جانے سے روکیں، اس کے ملک

---

[1] آزادی کے اسلامی تقاضے صفحہ ۲۶ - ۲۷

میں ایک غلط اور تباہ کن نظامِ تعمیر نہ ہونے دیں۔ اور اس امر کی پوری کوشش کریں کہ اس کے نئے اختیارات اور ذرائع و وسائل ایک تعمیرِ صالح میں صرف ہوں۔ ہمارے لیے قبل تقسیم کے طریق کا کیطرف پلٹنا اگر جائز ہو سکتا تھا تو صرف اسی صورت میں جب کہ ہم اپنے ان مقاصد میں ناکام ہو جاتے اور ہماری کوششوں کے باوجود ایک بے دین قیادت یہاں قدم جما کر ٹھیٹھ لادینی نظام قائم کر دیتی۔ اب اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ ہماری یہ جدوجہد بس حکمرانوں سے اسلامی دستور بنا دینے کے مطالبے تک ہی محدود تھی اور اس کے ساتھ معاشرے کی تیاری کا کوئی عنصر شامل نہ تھا، تو یہ اس کے اپنے ہی فہم کا قصور ہے۔ وہ آنکھیں کھول کر دیکھے تو اسے نظر آ سکتا ہے کہ اس جدوجہد کے ذریعہ سے ہم نے پچھلے دس سال کے اندر معاشرے کو کس حد تک فاسد قیادتوں کے بالمقابل ایک صالح قیادت ابھارنے کے لیے تیار کیا ہے، اور سلبی اور ایجابی دونوں حیثیتوں سے مخالفِ دین اثرات کی روک تھام اور موافقِ دین اثرات کو پھیلانے کی کتنی خدمت انجام دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مطالبۂ دستور کی جدوجہد کے اصل مخاطب حکمران گروہ کے لوگ سرے سے تھے ہی نہیں۔ اس کے مخاطب تو اس ملک کے عوام تھے اور انہی کی رائے کو نظامِ اسلامی کے حق میں ہموار کر کے ہم لادینی کے ان طوفانوں کا مقابلہ کر سکے ہیں جو آپ سب کی آنکھوں کے سامنے کیسی کیسی قوت کے ساتھ اٹھ کر اس ملک پر چھا جانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اگر ملک کی رائے عام کو اس حد تک تیار کر دینا کہ بے دینی اپنی ساری سیاسی طاقت اور اپنے سارے ذرائع کے باوجود یہاں فیصلہ کن اقتدار حاصل نہ کر سکے، اور اگر اقتدار کی ساری مزاحمتوں کے علی الرغم اسلامی نظام کی حمایت میں ایک ایسی منظم طاقت پیدا کر دینا جو دفاع اور ہجوم، دونوں کا بل بوتا رکھتی ہو، اور جس کے ساتھ ہر شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے عناصر وابستہ ہوں، اس کا نام معاشرے کی تیاری نہیں ہے تو میں اس طرح کے خیالات رکھنے والوں سے گزارش کروں گا کہ براہِ کرم وہ ہمیں وضاحت کے ساتھ بتائیں کہ معاشرے کی تیاری کا تصور ان کے ذہن میں آخر ہے کیا، اور اس تصور کے لحاظ سے کس چیز کو معاشرے کی تیاری کہا جا سکتا ہے اور کسے نہیں کہا جا سکتا۔

معاشرے پر دستوری جدوجہد کے اثرات

مجھے ہمیشہ اس بات سے نفرت رہی ہے کہ جماعت

اسلامی کے کارناموں کو گنایا جائے۔ میں ہمیشہ اس بات کو ترجیح دیتا ہوں کہ جو کچھ ہم سے نہیں ہو سکا ہے اسے ہم نمایاں کر کے اپنے کارکنوں کے سامنے رکھیں تاکہ ان میں مزید محنت و سعی کرنے کا ولولہ پیدا ہو، اور اس چیز کی حوصلہ شکنی کرتا ہوں کہ جو کچھ ہم نے کیا ہے اسے فخر کے ساتھ بیان کیا جائے اور اس کا نتیجہ یہ ہو کہ کارکن اپنی جگہ مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں۔ لیکن جب ہمیں سابقہ اس طرز بحث سے پیش آجائے کہ جو کچھ جماعت نے فی الواقع کیا ہے اس کی نفی کی جا رہی ہو، اور اس نفی سے بھی مقصود محض نفی نہ ہو، بلکہ استدلال یہ ہو کہ تقسیم کے بعد ہماری جدوجہد سرے سے غلط راستے ہی پر پڑ گئی، اور اس پر مزید استدلال یہ ہو کہ ہم اس وقت تک کے سارے نتائج عمل کو مہمل قرار دے کر قبل تقسیم کی حالت کی طرف الٹی زقند لگائیں، تو مجھے مجبوراً اس کام کو پیش کرنا پڑتا ہے جو پچھلے دس سال میں اس نئی پالیسی کے تحت انجام دیا گیا ہے:۔

—— تقسیم کے وقت ارکان جماعت کی کل تعداد ۳۸۵ تھی۔ آج ۱۲۷۲ ہے[1]۔ جماعت میں ارکان کے داخلہ کا جو طریق کار ہے اسے دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انسانوں کی کتنی کثیر تعداد تک پہنچ کر، اور ان کو کس حد تک متاثر کر دینے کے بعد یہ ۹۰۰ آدمی اس تحریک میں رکن کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے ہمیں حاصل ہوئے ہوں گے۔

—— متفقین کی تعداد اس وقت ہزار بارہ سو سے زیادہ نہ تھی آج ۲۵ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ جماعت میں متفقین کی بھرتی کا جو طریقہ ہے اسے نگاہ میں رکھئے تو حساب لگا کر آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ کتنے لاکھ آدمیوں تک یہ دعوت پہنچائی گئی ہو گی، تب کہیں ۲۵ ہزار آدمی ایسے نکلے جنہوں نے باقاعدہ متفق بننا قبول کیا۔

—— متاثرین آج لاکھوں ہیں اور معاشرے کا کوئی عنصر ایسا نہیں رہا ہے جس میں وہ کم یا زیادہ نہ پائے جاتے ہوں۔ سرکاری محکموں کے ملازمین، تجار، اہل صنعت، وکلاء، طلبہ، اساتذہ

---

[1] ۔ یہ تعداد اجتماع ماچھی گوٹھ کے وقت تھی۔ اب ۱۳۰۰ سے زائد ہو چکی ہے۔

اور پروفیسر، کاشتکار اور مزدور، شہری اور دیہاتی عوام، غرض کسی شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی اب ان اثرات سے خالی نہیں رہے ہیں۔ اور ان میں ایک کثیر تعداد ایسی ہے جو جماعت کے مقصد اور اس کے کام سے صرف گہری دلچسپی ہی نہیں رکھتی بلکہ اس کا اخلاقی اثر بھی قبول کر رہی ہے۔

—— دیہات تک میں یہ تحریک پھیل گئی ہے اور پھیلتی جا رہی ہے۔ پہلے دیہاتی علاقے اس سے بالکل خالی تھے۔ آج ان میں مضبوط حلقہائے متفقین منظم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

—— قریبی دور کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اتنے وسیع پیمانے پر عوام اور خواص کو اسلامی زندگی کی خصوصیات اور اسلامی ریاست کے واضح تصور سے آشنا کیا گیا۔ اس سے پہلے ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ اس ملک کے عوام کو اس کثرت کے ساتھ ان امور کی تعلیم دی گئی ہو۔ اور دنیا کے کسی دوسرے مسلمان ملک ہی میں آج اس کی مثال پائی جاتی ہے بلکہ عوام الناس میں دستوری مسائل کا شعور پیدا کرنے کی اتنے بڑے پیمانے پر کوشش تو مغربی ممالک میں بھی کم ہی کبھی کی گئی ہے۔

—— علمی حلقوں پر ہماری تحریک جس حد تک اثر انداز ہوئی ہے اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ پچھلے چند سال میں اسلام کے تصور ریاست، نظریۂ سیاسی، نظریۂ معاشی، نظام قانون اور نظام حیات سے جتنی کچھ بحث بھی ہوئی ہے وہ زیادہ تر انہی خطوط پر ہوئی ہے جو ہمارے لٹریچر میں پائے جاتے ہیں[1]۔ اب کوئی علمی اور تعلیمی ادارہ ایسا نہیں رہ گیا ہے جس میں

---

[1] پندرہ بیس سال پہلے ان موضوعات پر نہ صرف ہمارے ملک میں بلکہ دوسرے مسلم ممالک میں بھی جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا تقابل اگر بعد کے دور کی مطبوعات اور مضامین سے کیا جائے تو بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ آج ان مسائل کے متعلق اہل علم اور اہل قلم کے تصورات پہلے کی بہ نسبت کس قدر واضح ہیں اور ان میں اور جماعت اسلامی کے تصورات میں کتنی مماثلت پائی جاتی ہے۔

مغربی مذہب فکر کے مقابلے میں اسلامی مذہب فکر کے حامی بھی موجود نہ ہوں اور افکار کی دنیا میں ایک کشمکش رونما نہ ہو چکی ہو۔

—— مشرقی پاکستان، جو تقسیم کے وقت تک اس تحریک سے قطعاً غیر متاثر تھا، اس دس سال کی جدوجہد کے نتیجے میں اس حد تک تیار ہو چکا ہے کہ آج اشتراکیت اور بنگالی قوم پرستی کے مقابلے کا بل بوتا اگر کسی تحریک میں ہے تو وہ تحریکِ اسلامی ہی ہے۔

—— دستور میں اسلامی ریاست کے بنیادی اصولوں کا تسلیم کر لیا جانا ایک صریح پیمانہ ہے جو یہ بتاتا ہے کہ اس دس سال کی مدت میں رائے عام کو کس حد تک اسلامی نظام کے حق میں ہموار کیا گیا ہے، غیر اسلامی رجحانات کی حامی اور علمبردار طاقتیں اپنے سیاسی اقتدار اور کثیر ذرائع کے باوجود کس حد تک پیچھے ہٹی ہیں، اور اسلامی رجحان کی طاقت کہاں تک آگے بڑھی ہے۔ جو لوگ اس چیز کو حقیر ثابت کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ یہ دو رجحانات کی طاقت آزمائی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ صرف ایک طفل تسلی ہے، یا سیاسی پارٹیوں کے جوڑ توڑ سے پیدا ہو جانے والی ایک صورتِ حال کا اتفاقی نتیجہ ہے، یا بعض سیاسی لیڈروں کے اپنے ہی مذہبی رجحان کا ثمرہ ہے، وہ دراصل سخن پروری کے جوش میں حقائق کا انکار کرتے ہیں۔ پورے ۹ سال تک اس مسئلہ پر جو کشمکش علانیہ سارے ملک میں برپا رہی ہے، اور سیکولرزم کی حامی طاقتیں دستور میں اسلامی اصولوں کے اندراج کی مزاحمت جس طرح قدم قدم پر کرتی رہی ہیں اس کی تاریخ کچھ اتنی زیادہ پرانی تو نہیں ہے کہ آج کسی شخص کے دو چار فقرے اس کو جھٹلا دینے کے لئے کافی ہو جائیں۔ اس تاریخ کا ایک ایک ورق گواہ ہے کہ سیکولرزم کے علمبردار کس طرح بار بار اٹھ کر اسلامی رجحان کو دبانے کی کوشش کرتے رہے ہیں اور کس طرح اسلامی رجحان نے آخرکار رائے عام کی حمایت سے ان کا منہ پھیرا ہے۔ پھر میں نہیں سمجھتا کہ آخر کون سی سخن آرائی اس امرِ واقعہ کو جھٹلا سکتی ہے کہ دستور کی تدوین کے آخری مرحلے میں ملک کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک معاشرے کے ہر طبقے اور ہر عنصر نے بے نظیر اتفاق کے ساتھ

اسلامی دفعات کے اندراج کی پُرزور تائید کی تھی اور اسی نے اُن لوگوں کو یہ کڑوا گھونٹ حلق سے اتارنے پر مجبور کیا جو اسے پینے کی بہ نسبت زہر پی لینا زیادہ پسند کرتے تھے۔

—— دُنیا بھر کے مسلم ممالک پر ہماری دعوت کا اچھا خاصا اثر پڑا ہے۔ ہمارے لٹریچر نے ان کے صرف افکار ہی پر اثر نہیں ڈالا ہے بلکہ ان کی تحریکات کو بھی عملاً متاثر کیا ہے اور متعدد نئے آزاد ہونے والے مسلمان ملکوں میں اسلامی ریاست کے قیام اور اسلامی دستور کی تدوین کا مطالبہ اسی طرز پر اُٹھا ہے۔

میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا یہ امورِ واقعیہ ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں اور ان کی واقعیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تو آخر اس کام پر بھی "معاشرے کی تیاری" کے الفاظ کا کچھ اطلاق ہوتا ہے یا نہیں؟ صرف ۷۵ آدمیوں کی ابتدائی طاقت سے کام شروع کر کے صرف دس سال کی مدت میں اور اتنی سخت مزاحم طاقتوں کے مقابلے میں آپ کس دوسرے طریقے سے اتنا کام کر سکتے تھے؟ اور اگر ہر حیثیت میں اتنے بڑے پیمانے پر کام نہ کیا گیا ہوتا تو کیا آج آپ ترکی سے کچھ بہتر پوزیشن میں ہوتے جہاں تیس سال کے بعد اب اس چیز کو غنیمت سمجھا جا رہا ہے کہ درسگاہوں میں مذہبی تعلیم کی اجازت مل گئی ہے اور کچھ مذہبی رسالوں کی اشاعت بھی گوارا کی جانے لگی ہے؟

نکتہ ہفتم | اس کے بعد مجھے قرارداد کے ساتویں نکتے پر بحث کرنی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ اس دس سال کی جدوجہد سے جو نتائج حاصل ہوئے ہیں اُن کے بعد لائحہ عمل کے کسی جُز کو ساقط یا معطل یا مؤخر کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ دستور میں دینی نظام کے جو بنیادی اصول اس قدر طویل کشمکش کے بعد منوائے گئے ہیں اب اصل کام ان کو ملک کے نظام میں عملاً نافذ کرانا ہے اور ان کا نفاذ بہر حال قیادت کی تبدیلی پر منحصر ہے۔ اس موقع پر ایک صالح قیادت صرف اسی طرح بروئے کار لائی جا سکتی ہے کہ ہم اپنے لائحہ عمل کے چاروں اجزا پر بیک وقت کام کریں اور توازن کے ساتھ ان چاروں گوشوں میں کام کرتے ہوئے اس طرح آگے بڑھیں کہ افکار کی تعمیر و تطہیر، صالح افراد کی تنظیم اور معاشرے کی اصلاح کا جتنا جتنا کام ہوتا جائے اسی نسبت سے ملک کے سیاسی نظام میں دین

کے حامی عنصر کا نفوذ و اثر بھی بڑھتا جائے، اور سیاسی نظام میں حامیٔ دین عنصر کا نفوذ و اثر جتنا جتنا بڑھتا جائے اسی قدر زیادہ قوت کے ساتھ تطہیر و تعمیرِ افکار اور تنظیم عناصر صالحہ اور اصلاحِ معاشرہ کا کام انجام دیا جائے۔ اس مرحلے پر لائحۂ عمل کے کسی جزو کو ساقط کرنا کیا معنی، موخر کرنا بھی قابل تصور نہیں ہے۔

بحث کو مختصر کرنے کے لیے میں ابتداء ہی میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جہاں تک لائحۂ عمل کے پہلے تین اجزاء کا تعلق ہے جماعت میں کسی ایک شخص کا بھی یہ خیال نہیں ہے کہ ان میں سے کسی کو ساقط یا معطل یا مؤخر کیا جائے، اس لیے اس پر گفتگو کرنے کی سرے سے کوئی حاجت نہیں ہے۔ البتہ بعض لوگ جماعت میں ایسے پائے جاتے ہیں، جن کی خواہش یہ ہے کہ ایک اچھی خاصی طویل مدت کے لیے اس کے چوتھے جزء (زمامِ کار کی تبدیلی) کو چھوڑ کر صرف پہلے تین اجزاء پر کام کیا جائے۔ بلکہ بسا اوقات ان میں سے بعض حضرات کے طرزِ بحث سے یوں مترشح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اس چوتھے جزء پر سرے سے کام کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، صرف پہلے تین اجزاء پر ہی کام کر کے معاشرے کو اس طرح تیار کرنا چاہیے کہ نظامِ حکومت میں تغیر بالکل ایک طبعی نتیجے کے طور پر خود بخود ہو جائے۔ لہٰذا ہمیں اپنی بحث اسی نقطۂ نظر کی تنقیح و تنقید پر مرکوز رکھنی چاہیے۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ بجائے خود یہ نقطۂ نظر کہاں تک معقول ہے اور اپنی تحریک کے اس مرحلہ پر اگر ہم اپنے پروگرام کے سیاسی حصے کو ساقط یا معطل یا مؤخر کر دیں تو اس کے نتائج کیا ہوں گے۔

"خود بخود تبدیلی" کا نظریہ | اس سلسلے میں پہلی بات میں یہ عرض کرونگا کہ نظامِ سیاسی میں خود بخود تغیر ہو جانے اور قیادت کے آپ سے آپ بدل جانے کا عجیب و غریب تخیل تو میری فہم سے بالکل ہی بالاتر ہے۔ معاملہ اگر بخت و اتفاق کا ہو تو آدمی ہر حادثے کے ظہور کو ممکن مان سکتا ہے لیکن جہاں معاملہ مطلوب نتائج کے حصول کا ہو، میری ناقص فہم میں کسی نتیجۂ مطلوب کا بھی خود بخود برآمد ہو جانا ممکن نہیں ہے جب تک کہ انسان بالارادہ اُس کے لیے کوشش نہ کرے اور خاص طور پر اُن تدابیر کو استعمال نہ کرے جو اس مخصوص نتیجے کے لیے عقل اور فطرت اور دنیا کے تجربات کی رُو سے ضروری ہیں

آپ اگر کسی قلعہ کو مسخر کرنا چاہتے ہوں تو بلاشبہ قلعہ شکن آلات فراہم کرنا، حملہ آور فوجوں کو تیار کرنا، لوگوں میں اس کی تسخیر کی خواہش پیدا کر دینا، سب کچھ اس کے لیے ضروری ہے۔ لیکن یہ خیال کرنا کہ اس کام کے یہ مقدمات جب جمع ہو جائیں گے تو قلعہ خود ٹوٹ جائے گا یا قلعہ پر جو لوگ قابض ہیں وہ خود ایک روز آکر اس کی کنجیاں حوالے کر دیں گے، محض تخیل کی بلند پروازی ہے۔ قلعہ تو جب بھی مسخر ہوگا اسی طرح ہوگا کہ جو لوازم اور مقدمات اس کی تسخیر کے لیے آپ نے فراہم کیے ہیں اُن کو عملاً اس کام میں استعمال بھی کریں جو خواہش آپ نے اس کو مسخر کرنے کے لیے لوگوں میں پیدا کی ہے اسے واقعی تسخیر کے راستے پر لگائیں بھی جو آلات آپ نے قلعہ کے سامنے لا کر جمع کر دیئے ہیں ان سے فی الواقع قلعہ شکنی کا کام بھی لیں اور جو فوجیں آپ نے تیار کی ہیں انہیں لے کر حملہ آور بھی ہوں اور اہلِ قلعہ سے زور آزمائی بھی کریں۔ یہ کام اگر سرے سے آپ کی اسکیم ہی میں نہ ہو، بلکہ پہلے ہی سے دنیا کو یہ معلوم ہو کہ آپ "تیاریاں" کرنے اور "خواہشات" ابھارنے سے آگے کچھ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے اور قلعہ پر حملہ آور ہونا آپ کے پروگرام ہی سے خارج ہے، تو میں نہیں سمجھتا کہ وہ سادہ لوح حریف آپ کو دنیا میں کہاں ملیں گے جو کسی وقت قلعہ خود بخود چھوڑ بھاگنے پر تیار ہو جائیں گے، بلکہ میرے علم میں تو ایسی سیدھی سادھی آبادی بھی دنیا میں کسی جگہ نہیں پائی جاتی جو ان خالی خولی تیاریوں کے کام میں سنجیدگی کے ساتھ آپ سے تعاون کرے گی اور آپ کے ابھارے کوئی خواہش اس کے اندر تسخیرِ قلعہ کے لیے اُبھر سکے گی۔

بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ تقسیم سے پہلے اس خود بخود تبدیلی کا کوئی نسخہ جماعت اسلامی کے پاس تھا جسے تقسیم کے بعد جماعت گم کر بیٹھی ہے۔ جس چیز کو وہ اس نوعیت کا نسخہ سمجھ بیٹھے ہیں اس میں تو نظامِ باطل کے خلاف کشمکش اور فاسد قیادت کو ہٹانے کی جدوجہد کا جزو پوری طرح شامل تھا اور اس تخیل کا کوئی نشان اس میں نہیں پایا جاتا کہ اس جز کے بغیر نسخے کے دوسرے چند اجزا ہی استعمال کرنے سے نظامِ باطل خود جگہ چھوڑ دے گا اور اس کو چلانے والی قیادت آپ سے آپ مسندِ اقتدار سے ہٹ جائے گی۔

لائحہ عمل کے سیاسی جز کو ملتوی کرنے کے نتائج اس نظریے کو خارج از بحث کر دینے کے بعد زیادہ سے زیادہ جو تجویز قابلِ غور قرار پا سکتی وہ یہ ہے کہ ہم کسی معیّن یا غیر معیّن مدّت کے لیے اپنے لائحہ عمل کے سیاسی جز یعنی تبدیلیِ قیادت کی براہِ راست کوشش کو معطّل یا مؤخر کر دیں۔ لیکن ایسا کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ہمیں یہ اچھی طرح دیکھ لینا چاہیئے کہ اس کے نتائج کیا ہو سکتے ہیں، اور اس کی فی الواقع کوئی ضرورت بھی ہے یا نہیں۔

میرے نزدیک اس کا اوّلین نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے اس فیصلے کو سنتے ہی ملک کے وہ سب عوام اور خواص جو جماعت اسلامی سے اصلاحِ احوال کی کچھ امیدیں رکھتے ہیں، یکلخت مایوس ہو جائیں گے۔ سیاسی میدان سے پسپا ہونے کے بعد ان کی نگاہ میں یہ صرف ایک تبلیغی قسم کی جماعت بن کر رہ جائے گی اور ایسی کسی جماعت کو عوام تو درکنار خواص بھی کچھ زیادہ قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے جو ان کو صرف اصلاح کے وعظ سناتے مگر آج جن مسائل سے وہ عملاً دوچار ہیں ان میں نہ دخل دے اور نہ ان کے حل کی ذمہ داری لے کر اُٹھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کام کو جتنی مدت کے لیے آپ ملتوی کریں گے، اتنی ہی مدت کے لیے لوگ بھی آپ کی باتوں کی طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ کرنا ملتوی کر دیں گے۔ بلکہ بعید نہیں کہ وہ آپ کے اس فیصلے کا یہ اثر لیں کہ یہ کوئی مراقی جماعت ہے جس پر کبھی ایک دَورہ پڑتا ہے تو میدان میں آ کھڑی ہوتی ہے، اور کبھی کوئی دوسرا دَورہ پڑ جاتا ہے تو یکلخت پسپا ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں مشکل ہی سے پھر کبھی عوام کا اعتماد آپ پر جم سکے گا۔

دوسرا نتیجہ اس فیصلے کا یہ ہوگا کہ خود جماعت کے ارکان اور متفقین کی بہت بڑی تعداد بد دل ہو جائے گی۔ میرا اندازہ ہے کہ اس طرح کا فیصلہ صرف ایک مخصوص مذاق کے دو تین فی صدی آدمیوں ہی کو مطمئن کر سکتا ہے، باقی وہ عظیم اکثریت جو اس عزم و ارادے کے ساتھ اس جماعت سے وابستہ ہوئی ہے کہ حق و باطل کی اس کشمکش کو آخری فیصلے کی حد تک پہنچا کر ہی دم لینا ہے، اس کو بد دلی میں مبتلا ہونے سے ہم کسی طرح نہ بچا سکیں گے۔

تیسرا نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ اس ملک میں حامیِ اسلام محاذ کمزور پڑ جائے گا۔ یہ بات کسی سے چھپی

ہوئی نہیں ہے کہ اس محاذ پر کتنی اور کس کس قسم کی طاقتیں موجود ہیں، اُن میں سے ہر ایک کا حال بلحاظ نظم، بلحاظ صلاحیتِ عمل، بلحاظ عزم و ثبات و استقامت کیا ہے، اور ان کے درمیان جماعتِ اسلامی کا مقام کیا ہے۔ اب اگر یہ جماعت سیاسی میدان میں موجودہ قیادت کے راستے سے ہٹ جائے تو اس امر کا اندازہ کرنے کے لئے کسی بہت بڑی قوتِ فکر کی حاجت نہیں ہے کہ اس سے بحیثیتِ مجموعی حامیِ اسلام اور مخالفِ اسلام قوتوں کے توازن پر کیسا شدید اثر پڑے گا۔

اس کا چوتھا نتیجہ جو تیسرے نتیجے کے ساتھ لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے، یہ ہوگا کہ مخالفِ اسلام طاقتیں خوب ہمت پکڑ جائیں گی۔ آپ سب اس بات کو جانتے ہیں کہ اب تک کی کشمکش نے زیادہ سے زیادہ ان کو تھوڑا سا پسپا ہی کیا ہے، شکست نہیں دی ہے۔ حکومت کی مشینری پر انہی کا قبضہ ہے۔ پریس اور نشر و اشاعت کے ذرائع پر ان کی گرفت مضبوط ہے۔ معاشی زندگی پر بھی وہی چھائی ہوئی ہیں۔ رائے دہندوں کو دھوکے اور دھونس اور دھاندلی سے استعمال کرنے اور دھن سے خریدنے پر وہ پوری طرح قادر ہیں۔ ایک نیا دستور گھڑنے کے لیے وہ مختلف اشخاص اور اداروں کی ہمت افزائی کیے جا رہی ہیں۔ اور مخلوط انتخاب کے ذریعہ سے انہوں نے دستور کے اسلامی گوشے میں نقب لگا دی ہے۔ ایک طویل کشمکش کے بعد آخر کار جو کچھ بھی مفید چیزیں اسلامی اغراض کے لیے دستورِ مملکت میں شامل کرائی گئی ہیں ان کے کارآمد ہونے کا انحصار اب اس پر ہے کہ رہنما اصولوں پر عمل ہو، قانونی کمیشن ٹھیک کام کرے، اور انتخابات کے ذریعہ سے ایسے لوگ اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں جائیں جو دین کے لیے کم از کم محض کاغذی تو نہ رہنے دیں۔ یہ تینوں باتیں سخت جد و جہد اور موجودہ سیاسی قیادت پر پیہم دباؤ چاہتی ہیں۔ اگر جماعتِ اسلامی اس میدان سے ہٹ جائے اور اسلام کا حامی محاذ کمزور پڑ جائے تو اب تک کے سارے کیے دھرے پر پانی پھر جائے گا، اور دستور کا اسلامی حصہ محض ایک کاغذ کا پرزہ رہ جائے گا، بلکہ عجب نہیں کہ وہ سرے سے حذف ہی کر دیا جائے۔ اس کے بعد بے دین قیادت خوب کھل کھیلے گی اور جماعت کی طرف سے عوام کی سرد مہری دیکھ کر وہ اس امر کی ہر ممکن کوشش کرے گی کہ یہ جماعت پھر اس مقام پر واپس نہ آ سکے جہاں سے وہ خود ایک مرتبہ ہٹ چکی ہے۔

چکی ہے۔ اُس وقت اگر جماعت یہ چاہے بھی کہ اسلامی نظام کے حق میں کوئی تحریک اٹھا کر اس رَو کا رُخ پھیرے تو اس میں مشکل ہی سے وہ کامیاب ہو سکے گی کیونکہ عوام کو اپنے تدبّر اور معاملہ فہمی کا یہ نمونہ دکھا چکنے کے بعد ہمارا منہ کیا ہوگا کہ پھر ان کے سامنے اپیل کرنے کے لیے جائیں۔

علاوہ بریں جب جتنا بھی غور کر سکا ہوں میری سمجھ میں تو اب تک یہ بات آ نہیں سکی ہے کہ آخر اس کی مصلحت و ضرورت کیا ہے۔ دعوت و تبلیغ اور اصلاح معاشرہ کی کوششوں کا حاصل کیا ہوگا اگر ساتھ ساتھ اسی کے متوازی یہ کوشش بھی نہ ہوتی رہے کہ غیر اسلامی نظام کی حامی طاقتوں کو پیچھے دھکیل کر اسلامی نظام کی حامی طاقتیں زمردستی کے اختیارات پر تسلط حاصل کریں۔ اس کوشش کے نہ کرنے کا فائدہ کیا ہے اور اس کے کرنے کا نقصان کیا ہے؟ پھر یہ بات بھی میں نہیں سمجھ سکا ہوں کہ زمام کار کی تبدیلی کی خاطر سیاسی جدوجہد کے میدان میں اترنے کے لئے آپ اصلاح معاشرہ کے کتنے کام کی مقدار بطور شرط مقرر کریں گے اور کس پیمانے سے ناپیں گے کہ اس مقدار میں کام ہو چکا ہے یا نہیں ہوا؟

بقیہ رسائل و مسائل

میں اصلاح کے لیے منظم اجتماعی کوشش کرنا ناجائز تو کسی طرح نہیں ہے اور بعض صورتوں میں ایسا کرنا فرض بھی ہو جاتا ہے۔ اسے ناجائز قرار دینے کا خیال اسلامی ریاست کے فاسق حکمران کریں تو کریں، لیکن یہ عجیب بات ہوگی کہ اس کے صالح شہری بھی اسے ناجائز مان لیں۔ درآنحالیکہ اس کے عدم جواز کی کوئی شرعی دلیل سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اگر یہ چیز ناجائز ہو تو آخر ان آئمہ مجتہدین کا کیا مقام قرار پائے گا جنہوں نے بنی اُمیہ کے خلاف اُٹھنے والوں کی خفیہ اور علانیہ تائید کی؟

نماز کے بارے میں شرعی حکم یہی ہے کہ جہاں تک اذان کی آواز پہنچتی ہو وہاں کے لوگوں کو مسجد میں حاضر ہونا چاہیے۔ الا یہ کہ کوئی عذرِ شرعی مانع ہو۔ عذرِ شرعی یہ ہے کہ آدمی بیمار ہو یا اسے

کوئی خطرہ لاحق ہو، یا کوئی ایسی چیز مانع ہو جس کا شریعت میں اعتبار کیا گیا ہو۔ بارش اور کیچڑ پانی ایسے ہی موانع میں سے ہے، چنانچہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اصحابہ اس حالت میں اذان کے ساتھ الا صلوا فی رحالکم کی آواز لگا دیتے تھے تاکہ لوگ اذان سن کر اپنی اپنی جگہ ہی نماز پڑھ لیں۔ جماعت کے لوگ اگر اجتماع کرتے رہیں، اور نماز با جماعت پڑھنے کی بجائے بعد میں فرداً فرداً نماز پڑھ لیا کریں، تو یہ چیز سخت قابلِ اعتراض ہے۔ اس کی اصلاح ہونی چاہیے۔

کذب میں جھوٹ بہت بڑا گناہ ہے حتیٰ کہ اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے علاماتِ نفاق میں شمار کیا ہے۔ اس کے جواز کی گنجائش صرف اسی صورت میں نکلتی ہے جب کہ جھوٹ سے بڑی کسی برائی کو رفع کرنے کے لیے اس کی ضرورت ہو۔ مثلاً کسی مظلوم کو ظالم کے چنگل سے چھڑانا، یا میاں بیوی کے درمیان تعلقات کی خرابی کو رفع کرنا وغیرہ۔

اگر کسی کے پاس مقدار نصاب سے کم سونا ہو تو اس پر زکوٰۃ نہیں ہے خواہ اس کی قیمت چاندی کے نصاب کی قیمت سے کتنی ہی زیادہ ہو۔

کسی نماز میں کسی خاص سورت کا التزام کر لینا درست نہیں ہے۔ عادۃً پڑھنے میں مضائقہ نہیں۔ مگر کبھی کبھی اس کے خلاف بھی کر لینا چاہیے تاکہ بدعت کی سی صورت نہ پیدا ہو۔

فطرے کی مقدار میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ عرب میں جو اوزان اور پیمانے اُس وقت رائج تھے ان کو موجودہ زمانے کے اوزان اور پیمانوں کے مطابق بنانے میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ مختلف اہلِ علم نے اپنی تحقیق سے جو کچھ اوزان بیان کیے ہیں، عام لوگ ان میں سے جس کے مطابق بھی فطرہ دیں گے، سبکدوش ہو جائیں گے۔ اس معاملہ میں زیادہ تشدد کی ضرورت نہیں ہے۔ فطرہ ہر اس شخص کو دینا چاہیے جو عید کے روز اپنی ضرورت پوری کرنے کے بعد فطرہ نکالنے کی استطاعت رکھتا ہو اور بیوی مستطیع ہو تو وہ بیوی ہی پر واجب ہوگا کیونکہ اس کے شوہر کا نفقہ اس کے ذمہ نہیں ہے۔ لیکن میرے خیال میں اُسے اولاد کا فطرہ نکالنا چاہیے۔

اسلامی تحریک میں کارکنوں کے باہمی تعلقات

(۳)

۹۔ سلام! سلام کے ذریعہ اظہارِ جذبات کو ایک متعین صورت عطا کر کے اسے بھی ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر حقوق میں شامل کر دیا ہے۔ اس میں ایک طرف جذبات کا اظہار ہوتا ہے اور دوسری طرف اپنے بھائی کے لئے دعا کے ذریعہ خیر خواہی بھی۔ جب نبیؐ کریم نے مدینہ آکر پہلا خطبہ دیا تو چار باتوں کی ہدایت کی اور ان میں سے ایک یہ تھی۔

وافشوا السلام	سلام کو اپنے درمیان پھیلاؤ

اس سے بھی زیادہ اہمیت اس حدیث سے ظاہر ہوتی ہے۔

آپ نے فرمایا:

لا تدخلون الجنة حتی تؤمنوا ولا تؤمنوا حتی تحابوا او لا ادلکم علی شیئ اذا فعلتموہ تحاببتم، افشوا السلام بینکم	تم ہرگز جنت میں داخل نہ ہوگے یہاں تک کہ مومن ہو جاؤ، اور مومن اس وقت تک نہ ہوگے جب تک باہم محبت نہ کرنے لگو کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتا دوں جسکو اختیار کر کے تم باہم محبت کرنے لگو۔
مسلم عن ابی ہریرۃ۔ مشکوٰۃ ص ۳۹۷	تو وہ یہ ہے کہ آپس میں سلام کو پھیلاؤ۔

اور ایک مرتبہ مسلمان پر مسلمان کے چھ حقوق بتاتے ہوئے آپ نے فرمایا۔ ایک یہ ہے:۔

یسلم علیہ اذا لقیہ۔ مشکوٰۃ ص ۳۹۷	اس پر سلام کرے جب بھی اسے ملے

اس سلسلہ میں خاص طور پر سلام میں سبقت کرنے اور اولیت کا شرف حاصل کرنے کی تحریض کی گئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ

"سلام میں پہل کرنے والا تکبر سے پاک ہوتا ہے"۔

نیز یہ بھی فرمایا کہ

ان اولی الناس باللہ من بدأ بالسلام
(احمد، ترمذی، ابو داؤد عن ابی امامہ، مشکوٰۃ صفحہ ۳۹۹)

اللہ کی رحمت سے زیادہ قریب لوگوں میں وہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔

اور ظاہر ہے کہ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان آگے بڑھ کر اپنے بھائی کے لیے دعا کرے اور اس طرح اپنے جذبات کو ظاہر کرے۔ رسول اللہ جہاں گزرتے وہاں سلام میں پہل کرتے، خواہ وہ کوئی بھی ہو، مرد ہو یا عورت، یا بچے، بلکہ بچوں پر سلام کرتے ہیں، وہ خاص طور پہ پہل کرتے۔ سلام کی کثرت کی آپؐ نے اس طرح نصیحت کی کہ:

اذا لقی احدکم اخاہ فلیسلم علیہ فان حالت بینھما شجرۃ او جدار او حجر ثم لقیہ فلیسلم علیہ
(ابو داؤد عن ابی ہریرہ، مشکوٰۃ صفحہ ۳۹۹)

جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی سے ملے تو اسے سلام کرے، پھر اگر ان دونوں کے درمیان کوئی درخت یا دیوار یا پتھر یا کوئی آڑ آ جائے اور پھر ملے تو پھر سلام کرے۔

خاص طور پر آپ نے گھر والوں پر سلام کی نصیحت کی اور حضرت انسؓ سے کہا کہ:

یا بنی اذا دخلت علی اہلک فسلم یکن برکۃ علیک وعلی اہل بیتک
(ترمذی، مشکوٰۃ صفحہ ۳۹۹)

اے بیٹے جب تو اپنے گھر میں داخل ہو تو سلام کر، یہ تیرے اور تیرے گھر والوں کے لیے برکت کا باعث ہوگا۔

سلام کے ذریعہ محبت میں اضافہ اس وقت ہو سکتا ہے جب صحیح شعور کے ساتھ یہ ایک بھائی دوسرے بھائی سے سلامتی کی دعا کر رہا ہو، اور اس پر ظاہر کر رہا ہو، کہ وہ محبت و خیر خواہی کے کتنے جذبات اپنے دل میں رکھتا ہے ورنہ جیسا سلام آج کل رائج ہے کہ بہ طور عادت دو لفظ منہ سے نکل جاتے ہیں تو ظاہر ہے یہ محبت میں اضافہ کا سبب نہیں بن سکتا۔

۱۰۔ **مصافحہ** | سلام کے بعد دوسری چیز جو ملاقات کے وقت اپنے جذبات محبت کے اظہار کے لیے رسول اللہ نے بتائی وہ مصافحہ ہے۔ حضرت انس سے پوچھا گیا کہ کیا رسول اللہ صلعم کے اصحاب میں مصافحہ کا رواج تھا۔ انہوں نے کہا "ہاں" (بخاری، مشکوٰۃ صفحہ ۴۰۱)

در اصل مصافحہ سلام کے تتمہ یا تکمیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی سلام کی پوری اسپرٹ اس سے ہی مکمل ہوتی ہے۔ رسول اللہ نے خود اس چیز کو واضح کیا کہ

تمام تحیاتکم بینکم المصافحۃ

(احمد، ترمذی عن ابی امامہ، مشکوٰۃ ص ۴۰۲)

تمہارے باہمی سلام کی تکمیل مصافحہ سے ہوتی ہے۔

مصافحہ کے بارے میں رسول اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ مصافحہ کیا کرو۔ اس لیے کہ اس سے بغض دور ہو جاتا ہے۔

اور مصافحہ کے اجرا کے سلسلہ میں جو خوشخبری رسول اللہ نے دی وہ یہ ہے کہ:

ما من مسلمین یلتقیان فیتصافحان الا غفر لھما قبل ان یتفرقا۔ وفی روایۃ اخری فتصافحا وحمدا اللہ واستغفراہ غفر لھما۔

(احمد، ترمذی، ابن ماجہ، ابو داؤد عن براء بن عازب، مشکوٰۃ ص ۴۰۱)

جب دو مسلمان ملیں اور مصافحہ کریں تو ان کے جدا ہونے سے پیشتر ان کو بخش دیا جاتا ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ مصافحہ کریں، خدا کی حمد کریں اور اس سے مغفرت چاہیں تو ان کو بخش دیا جاتا ہے۔

۱۱۔ **اچھے نام سے یاد کرنا** | جو شخص بھی انسانی نفسیات سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ انسان کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ اس کو بہتر سے بہتر نام سے پکارا جائے اور جتنے محبت بھرے لہجہ اور بے تکلفی کے انداز میں مخاطب کیا جائے گا اتنا ہی اس کا دل پکارنے والے کی محبت اور خلوص سے متاثر ہوگا۔ اس معاملہ میں کبھی غفلت نہ کرنا چاہیے، بلکہ ہر ایک کی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ آدمی اپنے بھائی کو ایسے انداز میں پکارے جس سے اس کی محبت کے جذبات چھلکتے ہوں۔ ایسے تہذیبی تحریک میں ہر شخص اپنے برابر والوں اور بڑوں کو اس کے نام کے ساتھ بھائی لگا کر پکارتا

بھا اور چھوٹوں کا صرف نام لیا جاتا تھا۔ یہ ذہن میں رہے کہ یہ معاملہ اس طرح پکارنے کا ہے جن سے محبت جھلکتی ہو اور جس سے دوسرے کا دل خوش ہو۔ اس کی تو ایک پرخلوص اور محبت آمیز تعلق میں گنجائش ہی نہیں کہ بھائی اپنے بھائی کو اس طرح پکارے جو اس کو ناگوار ہو۔ خوش کلامی کی تمام احادیث اس معاملہ پر منطبق ہوتی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے کتنی صحیح بات کہی جب کہ آپ نے یہ بتاتے ہوئے کہ دوستی کن چیزوں سے مضبوط ہوتی ہے۔ فرمایا۔

"دوست کو اچھے نام سے بلائیے" (کیمیائے سعادت ۲۰۲)

۱۲۔ شخصی اور ذاتی امور میں دلچسپی | خصوصی محبت کا یہ ایک حق ہے کہ آدمی اپنے بھائی کے شخصی اور ذاتی معاملات میں اتنی ہی دلچسپی لے جتنی وہ اپنے شخصی اور ذاتی معاملات میں لیتا ہے جب ملے تو اس کے ذاتی حالات پوچھے ان میں پوری پوری دلچسپی کا اظہار کرے اس طرح ایک طرف تو ایک بھائی کو دوسرے بھائی کی خیر خواہی کا یقین ہوگا دوسرے ایک بھائی کے جذبات دوسرے پر ظاہر ہوں گے اور یہ چیز تعلق کے استحکام کا سبب بنے گی۔

نبی کریم نے اپنے ساتھیوں کو آپس میں شخصی و ذاتی طور پر تفصیلی تعارف کی ہدایت کرتے ہوئے اس مصلحت پر بھی روشنی ڈالی۔ آپ نے فرمایا۔

اذا آخی الرجل الرجل فلیسأله عن اسمه واسم ابیه وعمن هو فانه اوصل للمودة۔	جب ایک آدمی دوسرے آدمی سے بھائی چارہ کرے تو اس سے اس کا نام اس کے باپ کا نام اور اس کے قبیلہ کا نام پوچھ لے اس لیے کہ اس سے باہمی محبت کی جڑیں زیادہ مضبوط ہوتی ہیں۔
ترمذی عن یزید بن نعامہ مشکوٰۃ ص۴۲۷	

ذاتی نام وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو آدمی کی شخصی معاملات کا ہی ایک جزو ہیں اور اس طرح یہ حدیث اس اصول کی طرف اشارہ کرتی ہے جو اوپر پیش کیا۔ پھر یہ اشارہ کہ اس سے محبت کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں اصل حکمت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔

۱۳۔ ہدیہ | اپنے بھائی پر اپنی محبت و خلوص کے اظہار کے لیے ہدیہ دینا تعلق کے

استحکام کے لیے انتہائی موثر چیز ہے۔ اچھی بات کرنا، اچھے نام سے پکارنا، اپنی محبت کو ظاہر کرنا یہ سب زبان کے ہدیے ہیں جن کے ذریعہ ایک بھائی اپنے بھائی پر اپنی محبت ظاہر کر کے اس کو اپنے سے قریب لاتا ہے۔ ٹھیک جس طرح زبان کے ہدیے دلوں کو خوش کرتے ہیں اور دلوں کو جوڑنے میں اور اپنی طرف کھینچنے میں مدد دیتے ہیں اسی طرح مادی ہدیے بھی ایک دل کو دوسرے دل سے مربوط کرتے ہیں اور اس طرح باہم محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ نبی کریمؐ نے جہاں ہدیے دینے کی ترغیب دی ہے وہاں اس کا یہ فائدہ بھی بتایا ہے کہ یہ دلوں کی کدورتوں کو دھو دیتا ہے۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا:

تہادوا تحابوا وتذهب الشحناء بینکم (اوکما قال) ایک دوسرے کو ہدیہ بھیجا کرو تو باہمی محبت پیدا ہوگی اور دلوں کی دشمنی اور کدورت دور ہو جائے گی۔ مشکوٰۃ ۳۰۳۴

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے ساتھیوں کو کثرت سے ہدیے دیتے اور آپؐ کے اصحاب آپؐ کی خدمت میں اور باہم ایک دوسرے کو بھی ہدیے پیش کرتے۔ اس سلسلہ میں جو باتیں ہم کو پیش نظر رکھنی چاہییں اور جو ہم کو آپؐ کے اسوہ سے معلوم ہوتی ہیں، وہ یہ ہیں کہ:

(۱) ہدیہ ہمیشہ حسب استطاعت دینا چاہیے اور اس بنیاد پر دینے سے رک نہ جانا چاہیے کہ وہ کوئی قیمتی یا باحیثیت چیز نہیں دے سکتا۔ جو چیز دلوں کو جوڑتی ہے وہ ہدیہ کی قیمت و حیثیت نہیں ہوتی، بلکہ دینے والے کا خلوص اور اس کی محبت ہوتی ہے۔

۲۔ ہدیہ جیسا بھی ہو ہمیشہ شکر و امتنان کے جذبات کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔

۳۔ ہدیہ کے بدلہ ہمیشہ ہدیہ دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ مساوی حیثیت کے ہدایا ہوں، بلکہ ہر فریق اپنی حیثیت کے مطابق دے۔ نبی کریم صلعم کا یہ معمول تھا کہ آپؐ ہمیشہ ہدیہ کے بدلے کی کوشش کرتے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے لینے سے انکار کر دیا، تو آپؐ نے اس پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔

۴۔ ہدیہ میں سب سے پسندیدہ شے آپؐ کے لیے خوشبو تھی۔ آج کے حالات میں اسی نسبت میں کتاب کو بھی رکھا جا سکتا ہے۔

۱۴۔ شکر گذاری : جذبات محبت کے اظہار اور دوسرے کی محبت کے احساس کو ظاہر کرنے کا یہ ایک بڑا اچھا طریقہ ہے جب ایک بھائی یہ محسوس کرے کہ اس کا بھائی اس سے محبت کے جذبات اور محبت کے تحت کیے ہوئے کاموں کا پورا احساس کرتا ہے اور ان کی قدر و قیمت کو محسوس کرتا ہے تو اس کے دلی تعلق میں اضافہ ہوتا ہے۔ اگر محبت کرنے والے آدمی کو یہ احساس ہو کہ اس کے خلوص و محبت کی کوئی قدر نہیں تو اس کا دل بجھنے لگتا ہے اس لئے جب بھی ایک مسلمان دوسرے مسلمان بھائی کی کوئی مدد کرے یا اس کے ساتھ حسن سلوک کرے یا اس سے کوئی اچھی بات کہے۔ یا اس کو کوئی ہدیہ دے۔ تو اس مسلمان بھائی کا فرض ہے کہ وہ اس پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کرے اور اس طرح اس کو یہ بتا دے کہ وہ خلوص و محبت کی ہر ادا کی قدر و قیمت اپنے دل میں خوب محسوس کر رہا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں صحابہ بیان کرتے ہیں۔ جب کوئی آپ کی خدمت میں کوئی چیز پیش کرتا تو آپ اس کا شکریہ ادا کرتے اور اس کو قبول کر لیتے اور جب کوئی آپ کا کام کر دیتا تو اس پر اپنے امتنان کا اظہار کرتے (شمائل ترمذی)

۱۵۔ ساتھ مل کر کھانا : کھانے میں ایک دوسرے کے ساتھ شرکت اور ایک دوسرے کو اپنے گھر کھانا کھانے کی دعوت دینا بھی خلوص اور محبت کے جذبات کے اظہار کا ایک عملی طریقہ ہے۔ ایسے مواقع پر نہ صرف بے تکلفی سے گفتگو کے مواقع ملتے ہیں بلکہ جب ایک مسلمان بھائی اپنے بھائی کو اپنے گھر پر کھانا کھانے کی دعوت دیتا ہے تو جس شخص کو مدعو کیا جاتا ہے اس کے دل میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ میرا بھائی میرے لئے اپنے دل میں جذبات رکھتا ہے اور یہی احساس جواباً بھی پیدا ہو جاتے۔ تعلق کے مزید استحکام کا ضامن ہے۔ صحابہ کرام آپس میں بھی اکثر مدعو کرتے رہتے تھے اور نبی کریم کو بھی اکثر مدعو کرتے۔ خود نبی کریم کے پاس اگر کھانے کی کوئی چیز ہوتی یا کہیں سے آتی تو آپ پوری مجلس کو اس میں شامل کر لیتے۔ دعوت اور باہم ساتھ مل کر کھانے میں بھی وہ چیزیں سامنے رکھنا ضروری ہیں جو ہدیے کے ضمن میں آ چکی ہیں۔ پہلے یہ کہ دعوت پر تکلف کھانوں کو ہی نہیں کہتے بلکہ ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق کھلائے۔ خواہ وہ روزانہ کا کھانا ہو لیکن اس سلسلہ میں کچھ تخصیص اگر برتی جا سکے

تو دل پر اچھا اثر ڈالتی ہے۔ جس شخص کو دعوت دی جائے اس کا فرض ہے کہ اس کو قبول کرے اور شکر و احسان اور خوشی کے اظہار کے ساتھ قبول کرے اور آخری یہ کہ ہدیہ کی طرح دعوت کے بدل کی بھی کوشش ہونی چاہیئے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی سامنے رکھنی چاہیئے کہ شروع میں مسلمانوں کے دلوں میں اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے گھروں میں کھانا کھانے سے جھجک اور رکاوٹ پائی جاتی تھی۔ اس سلسلہ میں خود قرآن میں سورہ نور میں اللہ تعالیٰ نے آیات نازل کر کے اس جھجک کو دور کیا اور بے تکلفی پیدا کی۔

۱۱۔ دعا :- دعا ایک ایسی چیز ہے جو ایک طرف تو ان بہت سارے حقوق کو ایک مخصوص پہلو سے اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے جن پر ہم گفتگو کر آئے ہیں اور دوسری طرف ایک نئے پہلو سے الفت و محبت میں اضافہ کا سبب بنتی ہے۔ دعا میں ایک مسلمان اپنے بھائی کے لئے اپنے رب سے اس کی رحمت و مغفرت طلب کرتا ہے اس کی بھلائی کا خواستگار ہوتا ہے اور اس کے اصلاح، احوال کی درخواست کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ ہر مسلمان اس پر یقین رکھتا ہے کہ معاملات کی اصل کنجی اللہ کے ہاتھ میں ہے اور جب وہ اپنے بھائی کو دیکھتا ہے کہ وہ اس کے لئے اپنے رب کے آگے دست سوال دراز کر رہا ہے تو وہ بے انتہا متاثر ہوتا ہے۔

دعا غائبانہ بھی ہوتی ہے اور روبرو بھی، دعا کی ایک صورت وہ سلام ہے جس کی مکمل صورت میں انسان اپنے بھائی کے لئے سلامتی رحمت اور برکت کا طالب ہوتا ہے پھر ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کا یہ بھی حق ہے کہ اگر وہ چھینکے اور الحمد للہ کہے تو اس کے لئے رحمت کی دعا کی جائے — یرحمک اللہ، جب کسی مسلمان بھائی کی نماز جنازہ بھی ایک حق ہے اور یہ بھی دعا کی ایک صورت ہے جنازہ ہی کا جو طریقہ مسنون ہے اس میں بھی دعا ہے۔

دعا اگر روبرو ہو یا جس کے لئے دعا کی جائے اس کے علم میں آئے تو اس پر سب سے پہلا نتیجہ تو یہ مرتب ہوتا ہے کہ وہ اپنے بھائی کی دلی خیر خواہی اور محبت کا قائل ہو جاتا ہے۔ دونوں کے نزدیک اصل مقصود یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی رحمت ملتی ہے۔ اور جب وہ دیکھتا ہے کہ میرا بھائی میرے لئے نہ صرف ...

طور پر بھلائی کی کوشش کرتا ہے۔ بلکہ میری حاجتوں کو اسی طرح اللہ کے سامنے پیش کرتا ہے جس طرح اپنی حاجتیں، میرے دکھ درد پر اسی طرح تڑپ کر اپنے مالک کے آگے ہاتھ پھیلا دیتا ہے۔ جس طرح اپنے دکھ درد پر، میری خامیوں اور گناہوں پر اسی طرح مغفرت کا طالب ہوتا ہے جس طرح اپنے گناہوں پر، اور میرے لئے اس کی رضا اور رحمت کا اسی طرح طلبگار ہے جس طرح اپنے لئے اور پھر جب وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ میرا بھائی میرا اتنا خیال رکھتا ہے کہ اچھے موقعوں پر تنہائیوں میں جب وہ اور صرف اس کا رب ہوتے ہیں، میں اسے یاد رہتا ہوں، تو پھر اس کے دل میں اپنے لئے دعا کرنے والے بھائی کی محبت پیدا ہوتی ہے اور اس طرح اس دعا سے پورے فوائد حاصل ہوتے ہیں جو اظہار جذبات میں ہوتے ہیں۔

دوسری طرف دعا کرنے والا جب کوشش کرکے دوسروں کو دعا میں شریک رکھتا ہے تو اس کے قلبی تعلق میں اضافہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی تعلقات میں پاکیزگی آتی ہے۔

مغفرت و رحمت اور حاجت روائی اور مشکلات کو دور کرنے کی دعاؤں کے ساتھ اپنے بھائی کے لئے راہِ حق پر استقامت کی دعا اور باہمی الفت کی دعا کی بھی تلقین کی گئی ہے۔

اللّٰھم الف بین قلوبنا واصلح ذات بیننا

اسی طرح دلوں میں ناگواری، غبار یا کدورت کے دور ہونے کی دعا کی تلقین بھی کی گئی ہے اس لئے کہ دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے کدورت، کینہ یا شکایت ایسی بیماری ہے جس کے لئے گڑگڑا کر دعا مانگنی چاہیئے۔

ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان	اے رب ہم کو اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے
ولا تجعل فی قلوبنا غلاً للذین امنوا۔ ربنا	جو ایمان میں ہم سے سبقت لے گئے اور ہمارے
انک رؤف رحیم (حشر)	دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے کینہ نہ رہنے دے

اگر اپنے بھائی کا نام لے کر یا اس کا خیال کرکے دعا کی جاتی ہے تو اس سے مزید تعلق پیدا ہوتا ہے۔ خود اپنے طور پر اپنے بھائی کے لئے رحمت کی دعا کرنا اللہ تعالیٰ سے اس کی الفت و محبت کا سوال کرنا

اور تعلقات کو خرابی سے بچانے کے لئے گڑ گڑانا تو ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے ہی لیکن ایک دوسرے سے اپنے لئے دعا کی درخواست کرنا اور دعاؤں میں شریک رکھنے کی تمنا کا اظہار بھی تعلقات کے لئے مفید ہوتا ہے۔

مثلاً نبی کریم نے یہ فرمایا "کہ جب تم بیمار بھائی کے پاس عیادت کے لئے جاؤ تو اس سے بھی اپنے لئے دعا کراؤ۔ اس لئے کہ اس کی دعا زیادہ قبول ہوتی ہے"۔

اسی طرح جب حضرت عمرؓ حج کو جا رہے تھے تو آپؐ نے چند الفاظ کہے جن کے بارہ میں ان کا خود کہنا یہ ہے کہ "یہ مجھے اپنی پوری زندگی میں سب سے زیادہ عزیز ہیں" اور وہ الفاظ یہ ہیں:۔

"اے ہمارے بھائی ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا"

۱۷۔ بہتر طریقہ سے جواب دینا:۔ ایک مسلمان کی یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی محبت و خلوص کا جواب اس سے زیادہ اور بہتر خلوص اور محبت سے دے۔ اس لئے بھی کہ کوئی تعلق ایک طرفہ محبت سے پروان نہیں چڑھ سکتا۔ اس لئے بھی کہ اس طرح دوسرے بھائی کا دل مطمئن رہتا ہے کہ اس کی محبت نہ تو ضائع جا رہی ہے اور نہ اس کی ناقدری ہو رہی ہے۔ سلام کا جواب بہتر سلام سے دینے، ہدیہ کا جواب ہدیہ سے دینے اور ایک اچھی بات کا جواب ایک اچھی بات میں کہنے کی ہدایات اسی اصول پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ صلعم کی یہ حدیث بھی سامنے رہنی چاہیئے۔

"دو محبت کرنے والوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے بھائی کے لئے زیادہ محبت کرے"

اگر اپنے بھائی کی محبت کے جواب میں بہتر جواب ممکن نہ ہو تو کم از کم برابر کا ہی جواب ہونا چاہیئے اور ساتھ ہی اپنی کوتاہی کا اعتراف بھی دل کو متاثر کرتا ہے۔

۱۸۔ صلح کرنا اور شکایات دور کرنا:۔ تعلقات کی بنیاد کو ذہن میں رکھنے اور ان تمام تدابیر کو اختیار کرنے میں جو ایک طرف تعلقات کو خراب ہونے سے بچاتی ہیں اور دوسری طرف ان میں لطف و محبت اور الفت کے جذبات پیدا کرتی ہیں، بہت ساری کوتاہیاں اور خامیاں سرزد ہوتی ہیں کسی انسان کے لئے بھی یہ ممکن نہیں کہ اس سے کبھی بھی کسی غلطی کا صدور نہ ہو۔ پھر تعلقات چونکہ اسلامی

انقلاب کے لئے ضروری ہیں۔ اس وجہ سے شیطان بھی اس مورچہ پر بڑا سرگرم رہتا ہے۔ اور مسلمانوں کے تعلقات کو خراب کرنے کی اور ان میں فساد پیدا کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ تعلقات کے بارے میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان کو اگر سامنے رکھا جائے اور اس اصول پر ہمیشہ اپنے کو پرکھا جائے کہ کبھی اپنے بھائی کو اپنی جانب سے کوئی جسمانی ایذا یا دل آزاری نہ ہونے دو۔ خواہ یہ دل آزاری زبان سے ہو یا عمل سے، نیز ہر ممکن تدبیر اختیار کرنے کی کوشش کرو جس سے تم اپنے بھائی کی مدد کر سکو، دینی مدد ہو یا دنیوی اور اپنے خلوص و محبت کو پوری طرح ظاہر کرو اور دوسرے کے خلوص و محبت کے جواب میں اس سے زیادہ خلوص و محبت یا اتنے ہی خلوص کو پوری طرح ظاہر کرو کہ تم ان کی قدر و قیمت کو اچھی طرح محسوس کرتے ہو، تو اس اصول پر عمل کے بعد شیطان کو مشکل سے ہی دراندازی کا موقع ملے گا۔ پھر بھی اگر تعلقات میں کہیں خرابی پیدا ہوتی نظر آئے تو چند چیزیں ہیں جو مسلمان بھائی کو اپنے سامنے رکھنی چاہئیں اور ان کو سامنے رکھنے کے بعد اگر کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہو تو وہ بآسانی دور کی جا سکتی ہے۔ تعلقات کی خرابی کی بنیاد عام طور پر وہ شکایات ہوتی ہیں جو ایک مسلمان بھائی کے دل میں دوسرے بھائی کی طرف سے پیدا ہوتی ہیں۔ شکایتیں پیدا ہونے کی بنیادیں بہت سی ہو سکتی ہیں اور اس حصہ میں جن چیزوں پر گفتگو کی گئی ہے وہ انہی بنیادوں کو ختم کرتی ہیں۔ ہر ایک شکایت میں جو چیز مشترک ہوتی ہے وہ یہ کہ جب کسی مسلمان کے دل کو اپنے بھائی کے کسی قول یا فعل سے تکلیف پہنچتی ہے تو شکایت پیدا ہو جاتی ہے اگر بات بڑی ہو تو یہ شکایت خود خرابی تعلقات کے لئے کافی ہوتی ہے اور اگر چھوٹی ہو تو کئی چھوٹی چھوٹی باتیں مل کر ایک شدید احساس پیدا کر دیتی ہیں۔ اس سلسلہ میں دو ہی باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں جو بدگمانی کے ضمن میں کہی گئی ہیں۔

ایک یہ کہ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کو شکایت کا موقع نہ فراہم ہونے دے، اسے اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ اس سے دوسرے کے دل کو کبھی کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

دوسرے یہ کہ ہر مسلمان کو اپنے بھائی کے ساتھ وسیع القلبی سے پیش آنا چاہیے۔ حضورؐ کی اعلیٰ اخلاقی تعلیم کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اور حتی الوسع اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ کوئی شکایت پیدا نہ ہو اور اگر پیدا ہو تو فوراً اسے دل سے محو کر دیا جائے۔

تیسرے یہ کہ ان دونوں باتوں کے باوجود اگر شکایت پیدا ہو جائے تو پھر اس بات کو کبھی دل میں نہ رکھنا چاہیئے۔ اگر بھلانے میں کامیاب نہ ہو تو خواہ چھوٹی بات ہو یا بڑی فوراً اس کو اپنے بھائی پر ظاہر کر دے۔ اپنے بھائی کی طرف سے دل میں ذرا سا بھی میل رکھنا اور اس دل کے غبار کے ساتھ اس سے ملنا بدترین کردار ہے۔ اس میں کوئی تاخیر نہیں ہونی چاہیئے۔ بلکہ دل کی صفائی کی اصلاح کی فوراً کوشش کرنی چاہیئے

چوتھے یہ کہ جس کو شکایت بتائی جائے وہ اس پر ناراض نہ ہو اور ناک بھوں نہ چڑھائے بلکہ اپنے بھائی کا شکر گزار ہو جس نے خیانت کا ارتکاب کرنے کے بجائے اس پر ظاہر کر دیا۔ پیٹھ پیچھے نہ کہا۔ اور پھر یہ کہ تعلق کو اتنا قیمتی سمجھا کہ ذرا بات بھی ہوئی تو فوراً اصلاح کی کوشش کی اور یہ کہ اسے اصلاح کا موقع دیا۔

پانچویں یہ کہ جب اس کو معلوم ہو جائے کہ اس کے بھائی کے دل میں کوئی شکایت ہے تو فوراً اصلاح کی کوشش کرے جتنی مدت گزرتی ہے اتنی ہی خرابی جڑ پکڑتی جاتی ہے اور جتنا تازہ تازہ فتنہ کو کچل دیا جائے اتنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ پھر اگر واقعی اس سے غلطی ہوئی ہو تو اس غلطی کا کھلے دل سے اعتراف کرے اور اس پر اپنی ندامت کا اظہار۔ اگر اس غلطی کے لیئے کوئی عذر ہو تو وہ پیش کرے اور اگر غلطی نہ ہوئی ہو بلکہ کوئی غلط فہمی ہو یا اس کے پاس کوئی معقول عذر ہوں تو غلط فہمی کو صاف کر دینے کی کوشش کرے اس سلسلہ میں انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کے یہ الفاظ ایک مسلمان کے اس فریضہ پر موثر ترین انداز میں روشنی ڈالتے ہیں۔

> "پس اگر تو قربان گاہ پر اپنی نذر گزارتا ہو اور وہاں تجھے یاد آئے کہ میرے
> بھائی کو مجھ سے شکایت ہے تو وہیں قربان گاہ کے آگے اپنی نذر چھوڑ دے
> اور جا کر اپنے بھائی سے ملاپ کر تب اپنی نذر گزران"

یہ بڑی پتہ کی بات کہی گئی ہے۔ تمہارا بھائی تم سے ناراض ہو تو تمہارا ایک بہتر انسان بننا اور تمہارے تعلقات کا تمہارے بھائی سے خوش گوار بنیاد پر قائم ہونا مشکل ہے ہم اللہ کو جب ہی خوش کر سکتے ہیں جب عبادت کا اصل مقصد پورا ہو۔ اس لیئے نذر پیش کرنے سے پہلے اپنے بھائی کی شکایت دور کر کے

اصلاحِ حال کی کوشش کرنا چاہیے اور اس کام میں دیر نہ کرنا چاہیے۔

اور چوتھی بات یہ کہ جب ایک مسلمان بھائی اپنی غلطی کا اعتراف کرے تو اس کو معاف کر دینا اس کا حق ہے جس سے دست کش نہ ہونا چاہیے اور اگر وہ معذرت پیش کرے تو اس کو معذور سمجھنا اور اس کا عذر قبول کر لینا بھی اس کا حق ہے اور اگر وہ غلط فہمی کی صفائی میں کوئی بات پیش کرے تو اس کی بات پر یقین کر لینا بھی اس کا حق ہے۔ اس موقع پر نبی کریم کی بات سامنے رکھنا چاہیے:

"جس نے اپنے کسی مسلمان بھائی سے اپنی غلطی پر عذر کیا اور اس نے اس کو معذور نہ سمجھا یا اس کے عذر کو قبول نہ کیا۔ اس پر اتنا گناہ ہوگا جتنا ایک ناجائز محصول لینے والے پر اس کے اس ظلم کا ہوتا ہے"

ان ہدایات پر عمل اس وقت ممکن ہے جب انسان اپنے تعلقات کی قدر و قیمت کو اچھی طرح محسوس کرتا ہو اور اس کے دل میں اپنے بھائی اور اپنے بھائی کے جذباتِ محبت کی قدر ہو اور ساتھ ہی اسے اچھی طرح احساس ہو کہ تعلقات کی خرابی کتنا بڑا گناہ ہے۔ پہلی چیز کو گذشتہ دنوں کی گفتگو اور اسی حصہ کے دو سے جزو کی گفتگو کے بعد اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ دوسری چیز کے بارے میں بتا چکا ہوں کہ نبی کریم نے ان تعلقات کی خرابی کی اہمیت کو اس طرح واضح کیا ہے کہ یہ مونڈ دینے والا استرا ہے جو پوری طرح سے دین کا صفایا کر دیتا ہے۔ اور جو شخص یہ جانتا ہو کہ اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے وہ لازماً اپنے دین کو ہر قیمت پر محفوظ رکھے گا۔ اور جب اپنے دین کو محفوظ رکھنا چاہے گا وہ اپنے حسبِ استطاعت ان تعلقات کو کبھی خراب نہ ہونے دے گا۔ ایک دوسرے سے ناراض رہنے اور انقطاعِ تعلق کے بارے میں نبی کریم صلعم نے جو تنبیہات کی ہیں وہ بڑی موثر اور بڑی سخت ہیں۔ ایک موقع پر آپ نے فرمایا کہ:

لا یحل للرجل ان یہجر اخاہ فوق ثلث لیال یلتقیان فیعرض ھذا ویعرض ھذا وخیرھما الذی یبدأ بالسلام۔
(بخاری و مسلم عن ابی ایوب انصاری متفق علیہ)

کسی مسلمان کے لیے یہ بات حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی کو تین دن سے زیادہ ناراض ہو کر چھوڑے رہے دونوں ملیں تو ایک منہ ادھر کر لے اور دوسرا ادھر پھیر لے اور ان دونوں میں بہتر وہ شخص ہے جو سلام سے ابتدا کرے نیز

خفگی دور کرنے کی مصالحت کی ابتدا کرے؛

اس سے مصالحت میں پہل کرنے کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔ آپ نے یہ بھی بتایا کہ اللہ کے ہاں ایسے دو مسلمان بندوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔

آپ نے فرمایا کہ:-

تعرض اعمال الناس فی کل جمعۃ مرتین یوم الاثنین ویوم الخمیس فیغفر لکل عبد مؤمن الا عبداً بینہ وبین اخیہ شحناء فیقال: اترکوا ھذین حتی یصطلحا۔

(مسلم عن ابی ہریرہ۔ مشکوٰۃ ص ۴۲۸)

لوگوں کے اعمال ہفتہ میں دو دن پیر اور جمعرات کو پیش ہوتے ہیں اور ہر بندہ مومن کو بخش دیا جاتا ہے سوائے اس کے کہ جس کی اپنے مسلمان بھائی سے کوئی عداوت ہو۔ کہا جاتا ہے کہ ان کو کچھ دن کے لیے چھوڑ دو۔ تاکہ یہ آپس میں صلح کریں۔

جو شخص تین دن تک اپنے بھائی کو چھوڑے رکھے اس کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ

لا یحل لمسلم ان یھجر اخاہ فوق ثلث فمن ھجر فوق ثلث فمات دخل النار

(احمد وابوداؤد عن ابی ہریرہ مشکوٰۃ ص ۴۲۸)

کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی کو تین دن سے زیادہ کے لیے چھوڑ دے جو شخص تین دن سے زیادہ الگ رہا اور اسی صورت میں مر گیا تو وہ دوزخ میں جائے گا۔

اور یہ بھی فرمایا:-

من ھجر اخاہ سنۃ فھو کسفک دمہ

(ابوداؤد عن ابی ہریرہ خراش السلمی مشکوٰۃ)

جو شخص اپنے مسلمان بھائی کو ایک سال کے لیے ترک کر دے تو وہ ایسا ہے جیسا کہ اس نے اس کا خون بہایا (یعنی اتنا گناہ ہوگا)

اس سلسلہ میں ایک صورت حال یہ ہو سکتی ہے کہ ایک فریق نے اصلاح حال کی ہر کوشش کر کے ترک تعلق کیا ہو یا یہ کہ جھگڑے میں وہ حق پر ہو اس صورت میں عقلاً اور شرعاً اس پر کوئی گناہ عائد نہیں ہوتا لیکن اس صورت میں بھی اس کی ترغیب دی گئی ہے کہ وسیع القلبی سے کام لیتے ہوئے اپنے بھائی

کو معاف کر دیا جائے اور حق پہ ہوتے ہوئے بھی نزاع ترک کر دی جائے۔ رسول اللہ صلعم ایک حدیث میں ترکِ نزاع کی ترغیب اس طرح دیتے ہیں:

من ترک المراء وھو علی حق بنی لہ بیت فی وسط الجنۃ ومن حسن خلقہ بنی لہ فی اعلاھا
ترمذی عن انس بشکواۃ ص۴۱۲

جس نے نزاع اور جھگڑا ترک کر دیا۔ اس کے لئے جنت کے وسط میں ایک محل بنایا جاتا ہے اور جس نے اپنا اخلاق بہتر بنایا اس کے لئے جنت کی بلندیوں پر محل بنایا جاتا ہے

ظاہر ہے کہ حسن اخلاق کی انتہائی اعلیٰ منزل عفو ہے۔ جس کے بدلے انسان جنت کی اعلیٰ ترین بلندی پر جگہ کا مستحق قرار پائے گا۔

صلح کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمان بھائی اور مسلمان معاشرہ کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ دو بھائیوں کے درمیان تعلقات پر نگاہ رکھے اور جہاں خرابی محسوس ہو اس کی اصلاح کرے۔ اس لیے کہ اس اصلاح پر ہی تعلقات کا انحصار ہے اور یہ تعلقات ہی معاشرہ کی زندگی اور روح ہیں۔ قرآن نے اس اصلاح کا حکم یوں دیا ہے۔

"انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم (حجرات)

اور زیادتی کرنے والے فریق سے لڑائی تک کی بھی ہدایت کی ہے۔

رسول اللہ نے ایک دفعہ صحابہ سے پوچھا "میں تمہیں وہ عمل بتاؤں جس کا ثواب درجہ میں روزہ صدقہ نماز کے ثواب سے زیادہ ہے"؟ صحابہ نے کہا ہاں یا رسول اللہ ضرور بتایئے" فرمایا،

اصلاح ذات البین وفساد ذات البین ھی الحالقۃ۔
ابوداؤد ترمذی عن ابی داؤد ص۴۲۸

لوگوں کے درمیان (تعلقات کی) اصلاح کرنا اور لوگوں کے درمیان تعلقات میں خرابی ڈالنا دین کو مونڈ ڈالتا ہے۔

اور اس سلسلہ میں مزید یہ فرمایا (حالانکہ جھوٹ کے بارے میں اسلام کی روش بڑی سخت ہے) کہ

لیس الکذاب الذی یصلح بین الناس ویقول خیراً او ینمی خیراً (بخاری، مسلم عن ام کلثوم مشکوٰۃ) — وہ شخص جھوٹا نہیں جو لوگوں کے درمیان صلح کرائے اور بھلی بات کہے یا بھلی بات پہنچائے۔

یعنی ایک طرف سے دوسری طرف ایسے اچھے جذبات منتقل کرے جو فی الحقیقت ظاہر نہ کیے گئے ہوں اور جن کا اس طرح منتقل کرنا اصلاح کا سبب بن سکتا ہو۔ اس میں بہتر یہ ہے کہ بات اس انداز میں کی جائے کہ الفاظ میں جھوٹ نہ ہو اور ایک شخص دوسرے کی محبت اور خیر خواہی کا قائل ہو جائے۔

ان ہدایات کی روشنی میں اگر مسلمان خود بھی شکایت کا موقع نہ دیں اور اصلاح کی کوشش کرتے رہیں اور معاشرہ بھی چوکس رہے تو شیطان کو دراندازی کا موقع مشکل سے ہی مل سکتا ہے۔

تتمہ

اخوت، الفت، ولایت اور پیار و محبت کے تعلقات ایمان کی ایک شرط اور اس کا لازمی تقاضا ہیں جتنا مقصد عزیز ہوگا اتنا ایک بھائی کے لیے اپنے بھائی سے اخوت کا تعلق عزیز ہوگا جب ایک کا دکھ درد دوسرے کا دکھ درد، ایک کی تکلیف دوسرے کی تکلیف، ایک کی پریشانی دوسرے کی پریشانی اور ایک کی خوشی دوسرے کی خوشی بن جائے تو تعلقات ایک پہلو سے اپنے معیار کو پہنچ جاتے ہیں اور جب اس کے ساتھ رحمت بھی پیدا ہو جائے اور دینی خیر خواہی بھی تو پھر تعلقات ہر لحاظ سے معیاری ہو جاتے ہیں اور ایسے تعلقات ہی ایک جماعت تحریک کو وہ زندگی اور حرارت بخشتے ہیں جو اس کی کامیابی کی ضامن ہوتی ہے۔ یہ نعمت عظمیٰ جہاں ان تمام شرائط و تدابیر کو ملحوظ رکھنے سے نصیب ہوتی ہے جو خدا اور خدا کے رسول نے بتائی ہیں وہاں اس کے لیے توفیق الٰہی بھی ضروری ہے، اس لیے کہ یہ خاص عطیہ ربانی ہے۔ پس تدابیر کے ساتھ اپنے رب سے گڑگڑا کر التجا کرنی چاہیے کہ وہ ان تعلقات کو خرابی سے محفوظ رکھے اور ان میں الفت و محبت پیدا کرے۔

"والف بین قلوبھم لو انفقت ما فی الارض جمیعاً ما الفت بین قلوبھم ولکن اللہ الف بینھم"

"ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلاً للذین امنوا ربنا انک رؤف رحیم"

رسائل و مسائل

کیا اقامت دین فرض عین ہے؟

سوال: خاکسار کچھ سوالات کر کے جناب کو جواب دینے کی زحمت دینا چاہتا ہے۔ اگرچہ جناب کی مصروفیتوں کے پیش نظر یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا تاہم میں جناب ہی سے ان سوالات کے جوابات معلوم کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں کیونکہ ان میں بعض اہم سوالات اس نصب العین اور اس تنظیم سے متعلق ہیں جس کا شعور اور جس کا وجود اس دور میں آپ کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ میں ۹ سال سے اس جماعت سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس عرصہ میں میں نے اس کی تقریباً تمام کتابیں پورے غور و خوض کے ساتھ پڑھیں اور ایک علمی احساس فرض کے تحت بلکہ ایک اندرونی دباؤ کے تحت اس میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کی۔ میں نے قرآن و سنت کے دلائل سے مطمئن ہو کر اس جماعت کے نظم سے منسلک ہونا اپنے ایمان و اصلاح کا تقاضا سمجھا۔ میں جذباتی طور پر نہیں بلکہ پورے عقل و ہوش کے ساتھ یہ خیالات رکھتا ہوں کہ جس شخص پر اس جماعت کا حق ہونا واضح نہ ہوا ہو اس کا معاملہ تو اللہ تعالیٰ کے یہاں لائق عفو و درگزر ہے لیکن جس شخص کے دل و دماغ نے پکار کر یہ کہہ دیا ہو کہ اس برصغیر میں یہی ایک جماعت ایسی ہے جو اس دعوت حق کا کام صحیح طریق پر کر رہی ہے اور اس جماعت کے علاوہ اس سرزمین میں اور کوئی جماعت ایسی نہیں جس کا دامن فکر و کردار من حیث الجماعت اس طرح کی آمیزش سے پاک ہو تو اس شخص پر عند اللہ یہ فرض عین ہو جاتا ہے کہ وہ اس جماعت سے منسلک ہو اور اگر وہ اس وقت کسی دنیوی مصلحت کے پیش نظر یا کسی نفسانیت کی بنا پر اس جماعت سے اپنا تعلق منقطع کرے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس سے مواخذہ ہوگا۔ اللہ جانتا ہے کہ میں نے ان سطور میں کسی

گروہی عصبیت یا مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے بلکہ اس ناچیز نے جو کچھ سمجھا ہے وہ ظاہر کر دیا ہے۔ اگر اس میں کوئی غلط فہمی کام کر رہی ہے تو اسے رفع فرمائیے۔

یہاں میں سات آٹھ ماہ سے مقیم ہوں اور میری ایک ایسے بزرگ سے ملاقات ہے جو عالم دین ہیں، جماعت کی دعوت اور طریق کار کو عین حق سمجھتے ہیں اور جماعت کے باقاعدہ متفق بھی ہیں۔ اس کے باوجود ان کا خیال یہ ہے کہ فریضۂ اقامت دین جس کے لئے یہ جماعت کام کر رہی ہے وہ فرض عین نہیں بلکہ فرض کفایہ ہے۔ اس لیے جب اس میں کچھ لوگ حصہ لے رہے ہیں تو کوئی ضروری نہیں کہ اس میں ہر ایک شخص حصہ لے۔ اگر کسی شخص کی دنیوی مصلحتیں اسے اس کام سے روکتی ہیں اور وہ ان کی وجہ سے اس جماعت سے ہر قسم کا تعلق توڑ لیتا ہے اور اقامت دین کے لیے ذاتی طور پر بھی علیحدہ سے کوئی کام نہیں کرتا تو وہ کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا اور اس سے اللہ تبارک و تعالیٰ کے یہاں کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ اس کی مثال تو بس نماز جنازہ کی سی ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس وقت اور فرصت ہے اور اس کی طبیعت چاہتی ہے تو وہ اس میں شرکت کرلے اور اگر وقت و فرصت نہیں ہے اور طبیعت نہیں چاہتی تو اسے پورا اختیار ہے کہ اس میں حصہ نہ لے۔

یہ بات تو وہ فریضۂ اقامت دین کے بارے میں کہتے ہیں۔ اب رہی جماعت کی تنظیم، اس سے منسلک ہونا، اس کے امیر کی اطاعت، اس راہ میں آنے والی مشکلات پر صبر اور اس نصب العین کے لئے ہر قسم کی جانی، مالی قربانیاں تو ان امور کو وہ بالکل نوافل کا درجہ دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ صاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ یہ امور تو ایسے ہیں جیسے نماز تہجد جو اللہ تعالیٰ کے یہاں مراتب عالیہ کے حصول کے لیے تو ضروری ہے لیکن محض بخشش و نجات کے لئے ضروری نہیں ہے۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جن لوگوں نے اس راہ میں اپنی جانیں نثار کر دیں اور اپنی اولاد اور اپنے خاندان کی مستقبل کی زندگیوں کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تو کیا انہوں نے یہ سب کچھ محض ایک نفل کام کے لیے کیا؟ تو وہ اس کا جواب اثبات میں دیتے ہیں اور صاف کہتے ہیں کہ ان کی وہ ساری قربانیاں محض بلند مراتب کے حصول کے لیے تھیں ورنہ ایسا کرنا ان پر فرض نہیں تھا۔ انھوں نے یا تو اس

وقت کہیں جب ان کے سامنے اخوان کی مثال پیش کی گئی تو ان کا انداز رحمۃ اول اس قسم کا ہے کہ اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اخوان اور ایسے ہی دوسرے اہلِ حق جنہوں نے اللہ کے لئے اپنی جانیں نثار کر دیں وہ لائق ستائش ٹھہرنے کے بجائے الٹے لائق ملامت ٹھیریں گے۔ کیونکہ محض نفل کام کے لئے اپنی جان دینا اور اپنے پسماندگان کو کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ جانا غلو فی الدین نہیں تو اور کیا ہے اور اس کا مرتکب اللہ کے نزدیک مستحق عذاب ہی ہو سکتا ہے۔

نظم جماعت کی پابندی اور اطاعت امیر کا جب ذکر آتا ہے تو وہ کہتے ہیں ایسی مختلف تنظیمیں جو مختلف ادوار اور مختلف ممالک میں دین کا کام کرنے کے لئے قائم ہوں ان کے نظم کی پابندی اور ان کے امراء کی اطاعت فرض نہیں ہے۔ اطاعت تو رسول اللہ اور خلفائے راشدین کی فرض تھی نہ کہ ایسی جماعتوں کے امراء کی جو وقتاً فوقتاً مختلف ملکوں میں دین کا کام کرنے کے لئے تشکیل پاتی رہیں۔ اگر ان کی اطاعت فرض ہو جائے گی تو بس مسلمان اسی کے ہو رہے کہ ایسے خود ساختہ امیروں کی اطاعت کرتے رہیں گویا کہ اب کوئی اور کام تو کرنے کا رہا نہیں ہے۔ حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ وہ اس بات کو بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ اگر اس دور میں خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہو جائے تو اس کے امیر کی اطاعت بھی اسی طرح فرض ہوگی جیسے خلفائے راشدین کے دور میں تھی۔

ایک عالم دین کی زبان سے یہ باتیں سن کر میں سکتے میں رہ جاتا ہوں۔ میں نے اپنے ناقص علم کی حد تک انہیں مطمئن کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ان کا اول اور آخر جملہ یہی ہے کہ یہ باتیں فرضِ عین نہیں بلکہ فرض کفایہ یا نفل کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ وہ اندازِ فکر ہے جو تحریکِ اسلامی کے نشوونما کے لئے سم قاتل ہے اس کا کسی ایسے نوجوان کے کانوں میں پڑ جانا جس نے ابھی اس راہ میں قدم رکھا ہی ہے اس کے قوائے عمل کو مفلوج کر دینے کے لیے کافی ہے پس اس لئے نہیں کہ ان صاحب کو مطمئن کرنا ہے بلکہ اس لیے کہ اس کے اثرات دوسروں پر متعدی ہو سکتے ہیں، ان غلط خیالات کی تردید بہت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ یوں تو جماعت کا ... لٹریچر ... کا جواب پیش کرتا ہے لیکن خیال تھا کسی ایک جگہ اس کا مختصر اور مدلل جواب موجود نہیں ہے۔

ان صاحب کا ذہن بعض اصطلاحات میں اس طرح الجھا ہوا ہے کہ جماعت کے لٹریچر کے سارے دلائل انہیں بے متنق

معلوم ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جماعت کی کتابوں میں دلائل نہیں ہوتے۔ پہلے تو میں ان کے اس جملہ کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ کیونکہ جماعت کے لٹریچر کا دلائل سے مسلح ہونا ہی تو وہ وصف ہے جس کا لوہا مخالفین بھی مانتے ہیں۔ اس سے جب ان سے وضاحت چاہی گئی تو کہنے لگے کہ اس میں فقہ حنفی یا دیگر مکاتیب فقہ کی کتابوں کا حوالہ نہیں ہوتا قرآن و سنت سے محض اپنے ہی طور سے استدلال کیا جاتا ہے ان کی گفتگو کا لب لباب یہ ہے کہ اگر فقہ حنفی کی کسی کتاب میں یہ دکھا دیا جائے کہ اقامتِ دین اور اس کے لئے ایک جماعت کا قیام اور پھر اس کے نظم سے وابستگی اور اس کے امیر کی اطاعت فرضِ عین ہے تب تو وہ مانیں گے ورنہ وہ اس کے لیے تیار ہیں کہ اگر جماعت کے اجتماعات میں شرکت پر ان سے اصرار کیا جائے اور ہفتہ وار رپورٹ طلب کی جائے تو وہ "متفقیت" سے بھی مستعفی ہو جائیں گے۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر جواب میں فقہ حنفی کی کتابوں کا بھی حوالہ ممکن ہو تو دیا جائے شاید کہ ان کے دل کی گرہیں کھل جائیں۔

ایک بات میں اپنی طرف سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اکثر میرے ذہن میں یہ سوال ابھرتا رہا ہے کہ اسلام کے ارکان کی حیثیت سے پانچ چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں فریضہ اقامتِ دین کی جدوجہد شامل نہیں ہے حالانکہ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے چھٹے رکن کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے تھی اگر ایسا ہوتا تو اسلام محض نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ تک محدود نہیں رہ سکتا تھا بلکہ اس کے وہ تقاضے بھی ہر مسلمان کے سامنے ہمیشہ موجود رہتے جن کا شعور پیدا کرنے کے لئے علیحدہ سے ہر دور میں تحریکیں اٹھتی رہی ہیں۔ صراحتہً تحریر فرمائیے کہ دین کے اوامر میں فریضہ اقامتِ دین کی کیا حیثیت ہے۔

ایک صاحب جو بنک میں ہیں پہلے تو جماعت سے اس حد تک تعلق رکھتے تھے کہ رکنیت کی درخواست دینے والے تھے لیکن یکایک ان کے ذہنِ رسا میں ایک نکتہ پیدا ہوا اور وہ اپنا دامن جھاڑ کر جماعت سے اتنی دور جا کھڑے ہوئے گویا کہ انہیں جماعت سے کبھی کوئی تعلق رہا ہی نہیں تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ اسلامی دستور کی تشکیل کے بعد پاکستان ایک اسلامی ریاست بن چکا ہے اور یہاں تمام مسلمان شہری ایک نظامِ اطاعت میں منسلک ہو چکے ہیں یہ نظامِ اطاعت سب کا جامع اور سب پر فائق ہے۔ اب سب کی اطاعتیں اس بڑے نظامِ اطاعت کے گرد جمع ہو چکی ہیں۔ لہٰذا اس کی موجودگی

میں کسی اور نظم کا قائم ہونا اور افراد سے اپنی اطاعت کا مطالبہ کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک حکومت کے اندر ایک متوازی حکومت کا قائم کرنا۔ خلاصہ یہ کہ اب کسی جماعت کسی تنظیم اور کسی امیر کی ضرورت نہیں ہے۔ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے حکومت اس کا تنظیمی مظہر ہے۔ تمام مسلمان شہری اب کسی جماعت کے نہیں بلکہ اس ریاست کی ہمہ گیر تنظیم کے رکن ہیں اور اب ان کی تمام اطاعتیں اور وفاداریاں اسی تنظیم کا حق ہیں نہ کہ کسی اور جماعت کا۔ اب اطاعت کسی کی نہیں بلکہ ریاست کے صدر کی ہونی چاہیئے یہ دوسرا استدلال ہے کہ اس کے نتیجہ میں شہریوں کا حق انجمن سازی (RIGHT TO FORM ASSOCIATIONS) ہی ختم ہو جاتا ہے اور نہ صرف ختم ہو جاتا ہے بلکہ اس کا ذکر کرنا بھی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کے مترادف ہے۔ آپ کے پاس اس استدلال کا کیا جواب ہے ؟
کیا اسلامی ریاست واقعی ایک ایسی ریاست ہوگی جس میں کسی دوسری پارٹی کو جنم لینے اور جینے کا موقع نہیں ملے گا؟ اگر ملے گا تو ایک نظام اطاعت کے لحاظ سے اس کی کیا حیثیت ہوگی؟ کیا اب کسی مسلمان کا یہ استدلال درست ہے کہ اب اسے اسلام کے اجتماعی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کسی جماعت میں شریک ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ ایک اسلامی ریاست کا ایک شہری ہے عملی حیثیت سے یہ سوالات خاص اہمیت رکھتے ہیں اور ان کا جواب علمی طریق پر ہی دیا جانا چاہیئے۔

ایک سوال یہ ہے کہ شریعت میں نماز با جماعت کی کیا حیثیت ہے۔ یہ واجب ہے یا سنت مؤکدہ ہے یا واجب بالکفایہ یا سنت مؤکدہ بالکفایہ ہے بعض حالات یا عذرات میں اس کے وجوب یا تاکید کی سختی کم ہو جاتی ہے؟ یہاں مسجدیں کم اور دور دور ہیں لہٰذا اکثر لوگ گھروں پر نماز پڑھتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ چاہیں تو تھوڑی سی زحمت گوارا کر کے مسجد میں پہنچ سکتے ہیں لیکن کوئی تو فاصلہ کا عذر کرتا ہے کوئی اندھیری رات کا، کوئی پانی اور کیچڑ اور راستہ کی خرابی کا۔ کیا یہ عذر معقول ہیں؟ بعض لوگ جو اپنی دکان پر ہی نماز پڑھتے ہیں اور تنہا ہونے کا عذر پیش کرتے ہیں جو ان میں جماعت کے ارکان اور متفقین بھی ہیں۔ یہ لوگ احتجاج کرتے رہتے ہیں اور جماعت کا وقت نکل جاتا ہے بعد میں فرداً فرداً پڑھتے ہیں تحریر فرمایئے کہ یہ سب باتیں کہاں تک درست ہیں ؟

کبائر میں جھوٹ کا کیا درجہ ہے؟ کتاب و سنت میں اس کی جس قدر مذمت آئی ہے اور اس کے ترک کے لیے جتنی وعیدیں آئی ہیں، بیان فرمائیے کیا بعض حالات ایسے بھی ہیں جن میں جھوٹ بولنا مباح ہو جائے۔

اگر کسی شخص کے پاس ۷½ تولہ چاندی کی قیمت سے زیادہ قیمت کا سونا ہے لیکن ۷½ تولہ سے کم ہے اور چاندی بالکل نہیں ہے اور نہ روپیہ پس انداز ہو سکا ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ سونے کا نصاب ۷½ تولہ ہے۔

اکثر لوگ وتر کی تیسری رکعت میں بالالتزام سورہ اخلاص پڑھتے ہیں اور یہ بات خاص طور سے رمضان میں نظر آتی ہے جب تراویح کے بعد وتر جماعت کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ کیا یہ التزام کسی دلیل پر مبنی ہے یا محض رواج پر؟ کیا یہ التزام درست ہے؟

فطرہ کی مقدار کے بارے میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے کوئی سوا سیر گیہوں دیتا ہے تو کوئی پونے دو سیر اور کوئی سوا دو سیر۔ صحیح مقدار کیا ہے؟ اس سلسلہ میں آپ کا عمل کیا ہے؟ فطرہ کے سلسلہ میں دوسری بات یہ دریافت کرنی ہے کہ اگر کوئی شخص خود صاحب نصاب نہیں ہے بلکہ اس کی بیوی صاحب نصاب ہے تو فطرہ محض بیوی پر واجب ہوگا یا شوہر پر بھی اور یہ کہ اولاد کی طرف سے بھی فطرہ دیا جائے گا یا نہیں؟

جواب:- جماعت کے متعلق آپ نے اپنا جو نقطہ نظر بیان کیا ہے قریب قریب وہی نقطہ نظر تشکیل جماعت کے موقع پر میں نے بیان کیا تھا اور اس کے بعد برابر جزئیات لٹریچر کے ذریعہ پیش کرتا رہا ہوں کہ حق واضح ہو جانے اور یہ بات سمجھ لینے کے بعد کہ یہ جماعت برسر حق ہے اس کا ساتھ نہ دینا اللہ تعالیٰ کے ہاں قابلِ مواخذہ ہے البتہ وہ لوگ معافی کے مستحق ہو سکتے ہیں جو جماعت کے موقف کے بارے میں کوئی شک رکھتے ہوں یا اخلاص و دیانت کے ساتھ اس سے مطمئن نہ ہوں۔

آپ نے جن عالم دین کا ذکر کیا ہے ان کو یہ غلط فہمی ہے کہ اقامتِ دین کی سعی ہر حال میں صرف فرض کفایہ ہے حالانکہ یہ فرض کفایہ صرف اسی حالت میں ہے جب کہ آدمی کے اپنے ملک یا علاقے میں دین قائم ہو چکا ہو، اور کفار کی طرف سے اس دار الاسلام پر کوئی ہجوم نہ ہو، اور پیشِ نظر یہ کام ہو کہ آس پاس کے

علاقوں میں بھی اقامتِ دین کی سعی کی جائے۔ اس حالت میں اگر کوئی گروہ اس فریضے کو انجام دے رہا ہو، تو باقی لوگوں پر سے یہ فرض ساقط ہو جاتا ہے اور معاملہ کی نوعیت نمازِ جنازہ کی سی ہوتی ہے۔ لیکن اگر دین خود اپنے ملک ہی میں مغلوب ہو، اور خدا کی شریعت متروک و منسوخ کر کے رکھ دی گئی ہو، اور علانیہ منکرات اور فواحش کا ظہور ہو رہا ہو اور حدود اللہ پامال کی جا رہی ہوں، یا اپنا ملک دارالاسلام تو بن چکا ہو مگر اس پر کفار کے غلبے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہو تو ایسی حالتوں میں یہ فرض کفایہ نہیں بلکہ فرضِ عین ہوتا ہے، اور ہر وہ شخص قابلِ مؤاخذہ ہو گا جو قدرت و استطاعت کے باوجود اقامتِ دین اور حفاظتِ دین کے لیے جان لڑانے سے گریز کریگا۔

اس معاملے میں کتبِ فقہیہ کی ورق گردانی کرنے سے پہلے صاحبِ موصوف کو قرآن مجید پڑھنا چاہیے جس میں جہاد سے جی چرانے والوں کو سخت وعیدیں سنائی گئی ہیں حتیٰ کہ انہیں منافق تک ٹھہرایا گیا ہے۔ حالانکہ وہ نماز روزے کے پابند تھے۔ قرآن اس طرح کے حالات میں جہاد ہی کو ایمان کی کسوٹی قرار دیتا ہے اور اس سے دانستہ گریز بلکہ تساہل برتنے والوں کی کسی طاعت کو بھی لائقِ اعتنا نہیں سمجھتا۔ اس کے بعد اگر کسی توثیق کی ضرورت صاحبِ موصوف کو محسوس ہو تو وہ فقہ کی کتابوں میں جہاد کی بحث نکال کر دیکھ لیں کہ ہجومِ عدو کی صورت میں جہاد فرضِ کفایہ ہے یا فرضِ عین۔ جس زمانے میں فقہ کی یہ کتابیں لکھی گئی تھیں اُس وقت ممالکِ اسلامیہ میں سے کسی جگہ بھی اسلامی قانون منسوخ نہیں ہوا تھا اور نہ حدودِ شرعیہ معطل ہوئی تھیں۔ اس لیے انہوں نے صرف ہجومِ عدو ہی کی حالت کا حکم بیان کیا تھا۔ لیکن جب کہ مسلمانوں کے اپنے وطن میں کفر کا قانون نافذ اور اسلام کا قانون منسوخ ہو اور اختیارات ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوں جو حدود اللہ کی اقامت کو وحشیانہ فعل قرار دیتے ہیں تو معاملہ ہجومِ عدو کی نسبت کئی گنا زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔ اور اس صورت میں کوئی شخص جو دین کا کچھ بھی فہم رکھتا ہو، اقامتِ دین کی سعی کو محض فرضِ کفایہ نہیں کہہ سکتا۔

رہا نظمِ جماعت تو اس کے بارے میں یہ بات واضح ہے کہ احکامِ کفر کے مقابلہ میں احکامِ الٰہی کے اجرا کی کوشش بہرحال منظم اجتماعی جدوجہد کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اس کے لیے جماعت کا وجود، اور جو جماعت موجود ہو اس کا التزام ضروری ہے۔ اس مضمون پر کثیر التعداد احادیث دلالت کرتی ہیں۔ البتہ جہاں تمام اہلِ ایمان کی ایک جماعت موجود نہ ہو اور اس مقصدِ عظیم کے لیے اجتماعی قوت پیدا کرنے کی مختلف

کوششیں ہو رہی ہوں، تو التزام جماعت کے ان احکام کا اطلاق تو نہ ہوگا جو الجماعت کی موجودگی میں شارع نے دیئے ہیں، لیکن کوئی ایسا شخص جو اقامت دین کے معاملے کی شرعی اہمیت سے واقف ہو اور اس معاملہ میں ایک مومن کے فرض کا احساس رکھتا ہو، ان کوششوں کے ساتھ بے پروائی کا رویہ اختیار نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے لازم ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ ان کا جائزہ لے اور جس کوشش کے بھی صحیح و برحق ہونے پر مطمئن ہو جائے اس میں خود بھی حصہ لے۔ پھر حصہ لینے کی صورت میں (یعنی جب کہ آدمی ایک جماعت کو برحق جان کر اس سے وابستہ ہو چکا ہو) نظم و اطاعت کا التزام نہ کرنا سراسر ایک غیر اسلامی فعل ہے۔ یہ اطاعت محض نفل نہیں بلکہ فرض ہے کیونکہ اس کے بغیر فریضہ اقامت دین عملاً ادا نہیں ہو سکتا۔ احادیث میں اطاعت امر کے جو احکام آئے ہیں اور خود قرآن میں اطاعت اولو الامر کا جو فرمان خداوندی آیا ہے، ان کے متعلق یہ سمجھنے کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ احکام صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد کے لیے تھے۔ اگر یہ بات ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اب نہ کوئی اسلامی حکومت چل سکتی ہے اور نہ کبھی جہاد فی سبیل اللہ ہو سکتا ہے کیونکہ نظام کی پابندی اور سمع و طاعت کے بغیر ان چیزوں کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ میں سخت حیران ہوں کہ کوئی شخص جس کو علم دین کی ہوا بھی لگی ہو ایسی بے سروپا باتیں کیسے کہہ سکتا ہے۔

دوسرے جن صاحب کا آپ نے ذکر کیا ہے ان کی عقل نے وہ نکتہ پیدا کیا ہے جو ابھی تک "امیر المومنین" سکندر مرزا صاحب کو بھی نہیں سوجھا ہے۔ اگر یہ بات انہیں سوجھ جائے تو ملک کی تمام جماعتوں کو بیک جنبش قلم ختم کر کے ہمیشہ کے لیے ہر اس شخص کا منہ بند کر دیں جو یہاں احکام اسلامی کے اجراء کا نام لے اور پھر یہاں صرف رقص و سرود اور فسق و فجور ہی ہوتا رہے۔ اس کے بعد تو یہاں اطمینان کے ساتھ انگریزی دور کے قوانین چلتے رہیں گے اور شریعت کے نفاذ کی جدوجہد کرنے والے دنیا ہی میں نہیں آخرت میں بھی سیہ رو اور مستحق عذاب ٹھہریں گے، کیونکہ شرعاً وہ نفاذ شریعت کی سعی کرنے کے مجاز ہی نہ ہوں گے۔ مجھے تو یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ جن صاحب کی عقل و خرد کا یہ حال تھا وہ جماعت کو چھوڑ کر دور چلے گئے۔

اب آپ کے سوالات کا مختصر جواب عرض ہے:

(۱) فریضہ اقامت دین کی حیثیت سمجھنے میں آپ کو الجھن اس لیے پیش آئی ہے کہ آپ ارکان اسلام

اور فرائض اہلِ ایمان میں فرق نہیں کر رہے ہیں۔ ارکانِ اسلام وہ ہیں جن پر اسلامی زندگی کی عمارت قائم ہوتی ہے اور فرائض اہلِ ایمان وہ مقتضیاتِ ایمان ہیں جنہیں اسلامی زندگی کی تعمیر کے بعد پورا کیا جانا چاہیئے۔ ارکانِ اسلام قائم نہ ہوں تو سرے سے اسلامی زندگی کی عمارت کھڑی ہی نہ ہوگی۔ لیکن اس عمارت کے کھڑے ہو جانے کے بعد اگر مقتضیاتِ ایمان پورے نہ کیے جائیں تو یہ ایسا ہوگا جیسے جنگل میں ایک بے مصرف اور ویران عمارت کھڑی ہے۔ فریضہ اقامتِ دین اسلام کا ستون نہیں ہے بلکہ وہ اسلام کی عمارت تعمیر کرنے کے مقاصد میں سے اہم ترین مقصد ہے اور مزید برآں اسی پر اس عمارت کے استحکام اور اس کی آبادی اور اس کی توسیع کا انحصار ہے۔ اگر اس فرض کو معطل چھوڑ دیا جائے تو اسلام کی عمارت بتدریج بوسیدہ ہو جائے گی اور اس میں فسق و کفر کو قدم جمانے کا موقع مل جائے گا، اور اس کے وسیع ہو کر تمام خلائق کے لیے پناہ گاہ بننے کا تو کوئی امکان ہی نہ ہوگا۔ اسی لیے اس کام کو اسلام میں مسلمان کی زندگی کے مقصد کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔ جعلناکم امۃ وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس۔ اور کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر۔

۴۔ اسلامی ریاست کی ایک حالت وہ ہوتی ہے جس میں ریاست صرف نظریے کے اعتبار ہی سے اسلامی نہ ہو بلکہ عملاً حکومت بھی اسلامی ہو، صالح و متقی اہلِ ایمان اس کو چلا رہے ہوں، شوریٰ کا نظام اپنی حقیقی اسلامی روح کے ساتھ قائم ہو اور پورا نظامِ حکومت ان مقاصد کے لیے کام کر رہا ہو جن کی خاطر اسلام اپنی ریاست قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس صورت میں ریاست کا صدر ہی تمام اہلِ ایمان کا لیڈر ہوگا اور اس کی قیادت میں تمام اہلِ ایمان ایک جماعت ہوں گے۔ اس وقت جماعت کے اندر جماعت بنانے کی ہر کوشش غلط ہوگی، اور ایک امام کے سوا کسی دوسرے کی بیعت یا اطاعت کا کوئی جواز نہ ہوگا۔ دوسری حالت وہ ہے جس میں ریاست صرف نظریے کے اعتبار سے اسلامی ہو، باقی خصوصیات اس میں نہ پائی جاتی ہوں۔ اس حالت کے مختلف مدارج ہیں اور ہر درجے کے احکام الگ ہیں۔ بہرحال ایسی حالت

بقیہ ص ۴۳ پر

مطبوعات

منیر رپورٹ کا تجزیہ
بزبان انگریزی

طابع و ناشر:- مکتبہ جماعت اسلامی، پاکستان، کراچی، لاہور

اضطرابات پنجاب کی تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ کو، جو عام طور پر منیر رپورٹ کے نام سے مشہور ہے، پاکستان اور بیرون پاکستان کے اسلام دشمن حلقوں میں ایک "مقدس دستاویز" کی سی مقبولیت حاصل ہے۔ پچھلے تین سالوں میں اسلام، اسلامی ریاست، اسلامی نظام اور موجودہ دنیا میں اسلامی نظام حکومت کے قیام کے خلاف جتنا کچھ ملک کے اندر اور باہر لکھا گیا ہے اس کا بیشتر انحصار اس رپورٹ پر ہے۔ اب تک کسی مسلم یا غیر مسلم کی لکھی ہوئی کوئی کتاب اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس سے زیادہ استعمال نہیں ہوئی ہے۔ چونکہ یہ رپورٹ پاکستان کی عدالت عالیہ کے دو نامور ججوں نے تیار کی ہے اس لئے اس کو خواہ مخواہ استناد کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر اس امر کی شدید ضرورت تھی کہ اس رپورٹ کا تحقیقی جائزہ لے کر اس کی حقیقت دنیا کے سامنے کھول دی جائے۔ جماعت اسلامی نے اسی ضرورت کے پیش نظر دو سال پہلے اردو میں اس پر ایک مفصل تبصرہ شائع کیا تھا۔ اب اسی تبصرہ کو انگریزی میں منتقل کر کے انگریزی خوان طبقے کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس "تجزیہ" میں نہایت ہی دیدہ وری کے ساتھ اس رپورٹ کے اصلی خدوخال کھول کر رکھ دیے گئے ہیں، ان تمام غلط فہمیوں کو صاف کیا گیا ہے جو اس رپورٹ میں اسلام، اسلامی نظام اور اس کے حامیوں کے خلاف پھیلائی گئی تھیں، ان مسائل میں سے ہر ایک پر مفصل بحث کی گئی ہے جو رپورٹ کے مصنفین نے چھیڑے تھے، اور یہ حقیقت نمایاں کر دی گئی ہے کہ یہ رپورٹ ہر لحاظ سے ایک نہایت ناکام رپورٹ ہے۔ نہ اس نے اس مقصد کو پورا کیا ہے جس کے لئے تحقیقاتی عدالت بٹھائی گئی تھی، اور نہ علمی و عقلی حیثیت سے یہ کسی وزن کی مستحق ہے۔

منیر رپورٹ سے غالباً وہ حلقہ سب سے زیادہ متاثر ہوا ہے جو اسلام کے علم سے کورا ہے اور اس کے ساتھ جو مغربی نظریات سے مرعوب ہی نہیں مغلوب بھی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس رپورٹ کی شکل میں اُن کے ہاتھ

ایک ایسی "تلوار بے نیام" آگئی ہے جسے وہ اپنے دل پسند افکار کے پھیلانے میں جا بجا استعمال کرتا پھرتا ہے، تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ اس کی مدافعت کی یہی ایک صورت ہے کہ جو لوگ بالکل نادانستہ طور پر ان غلط ھیگھیوں کا شکار ہوگئے ہیں، انہیں یہ انگریزی تبصرہ دیا جائے تاکہ وہ جان سکیں کہ اس "طوفان" کی تہ میں کیا چھپا ہے۔

انگریزی ایڈیشن میں فاضل مترجم کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ بھی موجود ہے جس میں نہایت سلجھے ہوئے انداز میں رپورٹ کے مختلف پہلوؤں کے علاوہ "عاشقہ رواداری" کا تجزیہ کیا گیا ہے جس کا لادینی نظام کے حامی بہت ڈھول پیٹا کرتے ہیں۔ یہ مقدمہ بذاتِ خود ایک اونچی علمی کتاب کا درجہ رکھتا ہے اور اس بنا پر بڑی افادیت کا حامل ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ دنیا میں لادینی نظام کے حامیوں سے بڑھ کر ناروا داری متعصب اور تنگ نظر طبقہ اور کوئی نہیں ہے، اور یہ دراصل اس طبقہ کی مکاری ہے کہ جس جرم کا سب سے بڑھ کر مجرم وہ خود ہے اس کا الزام وہ اہلِ مذہب کے سر چپکا کر اپنا سیاہ چہرہ چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔

ہم اس کتاب کو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے نہایت ہی مفید پاتے ہیں اور اسے زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔ (ص)

لغات القرآن

مولفہ مولانا شہید الدین صاحب

شائع کردہ :۔ نور محمد، کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی صفحات ۴۱۴

فاضل مولف نے اس کتاب میں قرآن پاک کے تمام الفاظ کو اردو اور فارسی لغات کی طرز پر جمع کر کے ان کے اردو معانی بیان کئے ہیں۔ جہاں تک مولف اور ناشر کے اس جذبہ کا تعلق ہے کہ مسلمانوں کے لیے قرآن کا سمجھنا زیادہ سے زیادہ آسان بنایا جائے ہم اس کی انتہائی قدر کرتے ہیں۔ لیکن قرآن کے الفاظ کو اس طرح مرتب کر کے ان کے لغوی معنی بیان کر دینا ہم صحیح نہیں سمجھتے کیونکہ لغت کے اعتبار سے ایک لفظ کے متعدد معانی ہو سکتے ہیں اور قرآن میں بہت سے الفاظ مختلف مقامات پر مختلف معانی میں استعمال ہوئے ہیں کسی لفظ کو ایک جگہ قرآن نے جس خاص معنی اور مفہوم میں استعمال کیا ہے اس کا صحیح اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اسے قرآن ہی کے سیاق و سباق میں رکھ کر نہ دیکھا جائے، بلکہ اس کے ساتھ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ قرآن کے دوسرے

مقامات کی روشنی میں اس لفظ کا مفہوم کیا متعین ہوتا ہے۔ یہ چیز قرآن ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ کسی بھی زبان کے کسی لفظ کا اگر ہم دوسری زبان میں لفظی ترجمہ کرنا چاہیں تو ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ ایک یا چند لفظوں میں اس کا مفہوم پورا پورا ٹھیک ٹھیک بیان کر سکیں۔ اس سلسلہ میں بہتر یہی ہے کہ قرآن کی کسی عبارت کی ہم — خواہ عربی زبان میں یا کسی دوسری زبان میں — ترجمانی کریں اور اس کے الفاظ کے الگ الگ لغوی معانی بیان کرنے پر اکتفا نہ کریں۔ قرآن پاک کی جتنی تفسیریں اور تراجم اس وقت پائے جاتے ہیں، ان کا جواز صرف اس حیثیت سے ہے کہ وہ قرآن کے مدعا کی ترجمانی کرتے ہیں، نہ کہ اس کے الفاظ کے الگ الگ معانی بیان کرتے ہیں۔

قرآن پاک کو سمجھنا ہر مسلمان کا فرض ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ کہتے ہیں کہ کوئی ہرج نہیں سمجھنے کہ قرآن پاک کو تراجم اور ہر لفظ کے اردو معانی کے ذریعے سمجھنے سے انسان کو وہ گہرائی و معرفت حاصل نہیں ہو سکتا جو اسے اس کی اپنی زبان میں پڑھنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ دنیا کی کسی زبان میں کوئی ایسی کتاب نہیں پائی جاتی جس کی زبان کو لوگ معجز اور تمام دوسری کتابوں سے اعلیٰ و برتر بھی مانتے ہوں اور پھر وہ اس کے الفاظ کے الگ الگ معانی معلوم کر کے اور انہیں آپس میں جوڑ کر اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہوں۔ قرآن کو سمجھنے کا صحیح اور فطری طریقہ یہی ہے کہ اس زبان کو سیکھا جائے اور اس کا اپنے اندر زیادہ سے زیادہ ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی جائے جس میں قرآن کا نزول ہوا ہے۔ آپ غور فرمائیں کہ جو شخص اچھی اور بری عبارت کو جانتا ہی نہ ہو اور نہ دونوں میں کوئی فرق کر سکتا ہو وہ قرآن کے اعجاز اور اس کی زبان کی سلاست کا کیا اندازہ لگا سکتا ہے؟

مذکورہ بالا کتاب کے مؤلف نے اگرچہ قرآنی الفاظ کے معانی بیان کئے ہیں، بلکہ اکثر الفاظ کے ایک نہیں متعدد مختلف معانی بیان کئے ہیں جنہیں اگر لغت کی کتابوں کو سامنے رکھ کر جانچا جائے تو وہ سب صحیح ہیں، لیکن اس کتاب سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ قرآن نے کسی لفظ کو ان متعدد معانی میں سے اگر کہیں ایک معنی میں استعمال کیا ہے تو وہ کونسا معنی ہے اور اگر مختلف مقامات پر متعدد معانی میں استعمال کیا ہے تو کہاں کس معنی میں استعمال کیا ہے۔

پھر اس کتاب میں جہاں کہیں فعل کے معنی دیئے گئے ہیں وہاں اس کے ساتھ اس کا کوئی صلہ درج نہیں کیا گیا ہے حالانکہ عربی زبان میں افعال کے ساتھ صلات کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ایک ہی فعل کے معنی ایک صلہ کے ساتھ کچھ ہوتے ہیں اور دوسرے صلہ کے ساتھ کچھ اور۔

اسی طرح قرآن نے جن الفاظ کو ایک خاص ترکیب بنا کر استعمال کیا ہے انہیں اس کتاب میں الگ الگ بیان کر کے ان کے اصل مفہوم کو بالکل ہی ناقابلِ فہم بنا دیا گیا ہے۔ مثلاً اس کتاب میں "احکم" کے معنے دیئے گئے ہیں "سب سے بڑا حاکم" اور پھر آگے چل کر دوسرے مقام پر "حاکمین" کے معنی دیئے گئے ہیں "فیصلہ کرنے والا، حکم دینے والا۔ حاکم واحد" اب ان دونوں لفظوں کے الگ الگ معنی جان لینے کے بعد جب کسی ایسے شخص کے سامنے جو عربی زبان سے ناواقف ہو، یا معمولی عربی جانتا ہو "احکم الحاکمین" کی ترکیب آئے گی تو وہ اسے ہرگز نہیں سمجھ سکے گا۔ اسی طرح قرآن میں آیا ہے "واخفض جناحک للمؤمنین" اور اس کے معنی ہیں اہلِ ایمان کے ساتھ نرمی، محبت، شفقت اور رحمدلی کے ساتھ پیش آنا۔ اب اگر کوئی شخص مذکورہ لغت القرآن کی مدد سے "اخفض" اور "جناح" کے الگ الگ معنی جان لینے کے بعد اس کے اصل مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرے تو کیا وہ کامیاب ہو سکے گا؟

قرآن میں جہاں کسی فعل مضارع کے ساتھ کوئی ایسا حرف استعمال کیا گیا ہے جس سے وہ فعل اپنی اصلی حالت پر برقرار نہیں رہا ہے جیسے کم، لن، نونِ تاکید وغیرہ تو کتاب میں اس فعل کا ذکر کرتے وقت کسی حرف کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا جس سے ایک عربی نہ جاننے والے یا معمولی عربی جاننے والے شخص کو سخت دشواری پیش آسکتی ہے مثلاً قرآن میں ہے "لاُمَتِّعَنَّکَ" کتاب میں "امتع" کے معنی تو دیئے گئے ہیں لیکن اس پر نونِ تاکید آنے کی وجہ سے اس کے معنی پر جو اثر پڑا ہے اس کا کوئی اندازہ کتاب سے نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح قرآن میں جہاں کوئی فعل امر اپنے سے پہلے کسی لفظ سے مل کر استعمال ہوا ہے اور اس حالت میں اس کے ہمزۃ الوصل پر کوئی حرکت نہیں ہے تو کتاب میں اسے اس کی اصل حالت یعنی ہمزۃ الوصل کی حرکت کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ کیا کوئی شخص جو عربی قواعد سے پوری طرح واقف نہ ہو اس کا ذہن اس طرف جا سکتا ہے کہ "فادعوا" کے معنی معلوم کرنے کے لئے "اُدعوا" کی طرف رجوع کرے؟

افسوس کہ کتاب کے شروع میں کوئی ایسا دیباچہ بھی نہیں دیا گیا جس میں یہ واضح کیا جاتا کہ کم استعداد رکھنے والے لوگ اس کتاب سے کیونکر استفادہ حاصل کر سکتے ہیں:

پوری کتاب کا جائزہ تو ہم نہیں لے سکے البتہ اس کے مختلف صفحات پر نظر ڈالنے سے ہمیں جو اندازہ ہوا وہ یہ ہے کہ اس میں بعض سخت قسم کی غلطیاں ہیں جن سے بہرحال اس کتاب کو پاک ہونا چاہیے تھا اور مؤلف اور ناشر دونوں کا

فرض تھا کہ کتاب شائع کرنے سے پہلے کسی صاحب استعداد عالم سے اس پر نظر ثانی کرا لیتے۔ اگر رسالہ قرآن کے علاوہ کسی دوسری کتاب کا ہوتا تو شاید یہ لاپرواہی ہمارے لیے قابلِ درگذر ہوتی۔ پوری کتاب کی غلطیوں کی نشاندہی کرنا ہمارے لیے طوالت کے خوف سے مشکل ہے تاہم چند غلطیوں کی طرف اشارہ کر دینا ہم ضروری سمجھتے ہیں:

۱۔ اُبْنِ ۔ تو بنا، تو تعمیر کر (ص ۸) مولف نے اس فعل کو واوی سمجھتے ہوئے اسے باب نَصَرَ (ن۔ ہ) سے درج کیا ہے حالانکہ یہ فعل یائی ہے اور باب ضَرَبَ (ض۔ ب) سے ہے اور اسی طرح قرآن میں استعمال ہوا ہے "یاھامٰنُ ابْنِ لِی صَرْحًا"

۲۔ اَخُونُ ۔ میں خیانت کرتا ہوں (ص ۱۱) یہ لفظ دراصل اَخُوْنُ ہے جیسے معلوم نہیں مولف نے کیسے آخُونُ کر دیا حالانکہ آخُونُ عربی زبان میں سرے سے کوئی لفظ ہی نہیں ہے۔ غالباً مولف نے قرآن کے لفظ لَمْ اَخُنْهُ سے لَمْ اڑا کر اسے اپنی اصلی حالت میں درج کرنے کی کوشش کی مگر غلطی کر گئے۔

۳۔ اِجْمَعُوْا ۔ تم جمع کرو (ص ۱۲) مولف نے یہ فعل باب ضَرَبَ (ض۔ ب) سے درج کیا ہے حالانکہ یہ باب فَتَحَ (ف۔ ت) سے ہے اور اسی طرح قرآن میں استعمال ہوا ہے

۴۔ کُفُّوْا : وہ روکے گئے (ص ۲۲۳) لغت کے اعتبار سے یہ معنی تو صحیح ہیں لیکن کُفُّوْا کا لفظ قرآن میں صرف ایک جگہ استعمال ہوا ہے اور وہاں اس کے معنی ہیں "تم روکو" "فَلَمَّا قِیْلَ لَھُمْ کُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ"
اس سے قارئین کو یہ اندازہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی لفظ کا معنی معلوم کرنے کے لیے اس کے سیاق و سباق کو دیکھنا کتنا ضروری ہے

۵۔ حَکَمَ ، اس نے حکم دیا (ص ۱۱۹) یہ معنی بھی غلط ہیں۔ حَکَمَ کے لغوی معنی ہیں "اس نے فیصلہ کیا" اور اس معنی میں قرآن میں متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے۔

۶۔ اِسْتَجَارَ : اس نے نوکر رکھا (ص ۲۳) یہ معنی بھی غلط ہیں اور صحیح معنی ہیں "اس نے پناہ مانگی"۔ قرآن میں ہے۔ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ اسْتَجَارَکَ "۔ غالباً مولف کو استاجر کے لفظ سے اشتباہ ہو گیا

یہ چیز بھی قابلِ ذکر ہے کہ کتاب کے اکثر مقامات پر جہاں بھی ہماری نظر پڑی، مولف نے غیر منصرف الفاظ کو منصرف درج کیا ہے۔ جیسے احمدٌ، ابیضٌ، احادیثٌ، اراٰئکٌ وغیرہ۔ ممکن ہے یہ اصلاح کاتب صاحب نے فرما دی ہو لیکن پروف پڑھتے وقت اس قسم کی سخت غلطیوں کا نظر سے رہ جانا حیرت انگیز ہے۔

م۔ ع۔ ح

خالی صفحہ

پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور